سہ ماہی

کاروانِ ادب لکھنؤ

ادب ایک طاقت ہے

”ادب دراصل انسان کے وجدان سے بنتا ہے، اور انسان کے وجدان کو متاثر کرتا ہے، وجدان کی طاقت وصلاحیت اللہ تعالیٰ نے تقریباً ہر انسان کو دی ہے، خواہ محقق و مفکر ہو، اور خواہ جاہل و عامی، اس کی وجہ سے ادب کا دائرہ کار بھی بہت وسیع ہے، اسی لیے ادب کے ذریعہ بھی مخاطب کے وجدان کو صرف لطف ولذت دینے کا کام کیا گیا، کبھی محض اپنی مرضی کے خیال کو جاگزیں کرنے کا مقصد حاصل کیا گیا، اور کبھی مخاطب کے کسی انسانی تقاضے کی رعایت میں تسکین کا سامان کیا گیا، کبھی اس سے اصلاح عوام کا کام لیا گیا، اور پوری پوری قوم میں تبدیلی لے آئی گئی، یا اس کو ایک بالکل نئے یا متضاد رخ پر ڈال دیا گیا، اور اس سے غیر ملکی طاقتوں کو مبغوض بنا کر مطرود کرنے کا کام لیا گیا، اس طرح ادب ایک طاقت ہے، ایک اثر انگیز ذریعہ ہے، ایک انسانی تقاضہ کا فطری جواب ہے۔“

(حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ)

مرکزی دفتر رابطہ ادب اسلامی (عالمی)

شعبۂ برصغیر، لکھنؤ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سہ ماہی

کاروانِ ادب لکھنؤ

جلد: ۲۸ — اپریل، مئی، جون 2025ء مطابق شوال، ذی قعدہ، ذی الحجہ ۱۴۴۶ — شمارہ: ۱

مشرف عام: مولانا سید بلال عبد الحی حسنی ندوی (صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی)

مجلس مشاورت:

- مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی (نائب صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی)
- ڈاکٹر شفیق احمد خان ندوی (جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی)
- ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی ندوی (دہلی)
- مولانا محمد علاء الدین ندوی (صدر شعبہ عربی، دار العلوم ندوۃ العلماء)
- مولانا اقبال احمد ندوی (وکیل کلیۃ اللغۃ العربیہ دار العلوم ندوۃ العلماء)
- مولانا محمد الیاس بھٹکلی ندوی (استاذ جامعہ اسلامیہ بھٹکل، کرناٹک)

مدیر تحریر: ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی

نائب مدیر: محمد عمیر الصدیق ندوی

معاون ادارت: محمد نفیس خان ندوی

معاون انتظامی

- مشہود السلام ندوی
- محمد وثیق ندوی

مجلس ادارت

- نعیم الرحمن صدیقی ندوی
- انیس احمد ندوی
- عبد الرحیم ندوی
- محمد سمعان خلیفہ ندوی
- شاہ اجمل فاروق ندوی

فی شمارہ/50 روپیے — صدر دفتر: رابطہ ادب اسلامی عالمی - پوسٹ بکس نمبر: 93 ندوۃ العلماء، لکھنؤ — سالانہ 200/روپیے

آئینۂ مضامین

۱	ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا	محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی	۳
۲	خداوندا تجھی سے چاہتے ہیں ہم مددگاری (نظم)	مولانا محمد عرفان ندوی (گوپامئو)	۵
۳	نواب صاحب چھتاری۔خطوط کے آئینہ میں	مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ	۶
۴	فغان نیم شب (نظم)	جناب پروفیسر ہارون الرشید	۱۰
۵	خطبۂ صدارت (بجنور)	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ	۱۱
۶	شریعت کا یہی دل ہے (نظم)	حکیم شریف احسن	۱۶
۷	خطبہ صدارت (جے پور)	مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ	۱۷
۸	سکریٹری رپورٹ (جے پور)	محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی	۲۱
۹	ادب اطفال کے چند باکمال معمار	مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندویؒ	۲۷
۱۰	رمز عرفان (نظم)	سورج نارائن مہر	۳۳
۱۱	جلیل القدر مربی۔مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ	ڈاکٹر شفیق احمد خان ندوی	۳۴
۱۲	موج نسیم مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	جناب علیم ناصری	۳۷
۱۳	قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم	مولانا محمد علاء الدین ندوی	۳۸
۱۴	حضرت مولانا شاہ محمد عبد الرحیم نقشبندیؒ	مولانا اقبال احمد ندوی	۴۸
۱۵	علامہ شبلیؒ کا دعوتی اسلوب	مولانا محمد الیاس بھٹکلی ندوی	۵۲
۱۶	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی شگفتہ مزاجی	جناب محمد یسین ذکی (بجنور)	۵۴
۱۷	الوداع! اے میرے محبوب وطن	مولانا عبد الرحیم ندوی	۵۷
۱۸	مولانا الطاف حسین حالیؒ۔مسدس کے آئینہ میں	مولانا انیس احمد ندوی	۶۱
۱۹	تیرا ہی کرم (نظم)	منشی گرو نارائن لطفؔ	۶۶
۲۰	اہل دل کا کلام	محمد وثیق ندوی	۶۷
۲۱	مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ۔ادب اسلامی کے نقیب	محمد نفیس خان ندوی	۷۴

مدیر کے قلم سے

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

ندوۃ العلماء اور اس کی تحریک اور تاریخ کا جب بھی ذکر ہوتا ہے اور اس کے مقاصد پر گفتگو ہوتی ہے تو بجا طور پر اس تحریک کے ذریعہ دینی مدارس کے نصاب کی اصلاح کی کوششیں زیر بحث آتی ہیں۔ اس کوشش کو بنیادی درجہ اس لیے دیا گیا کہ وقت کے تقاضوں اور زبان و بیان کی باریکیوں کو سامنے رکھ کر دعوت و تبلیغ کا فریضہ بطریقِ احسن ادا کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے ندوہ کے باکمال اور منتخب روزگار بانیوں نے اشاعتِ اسلام اور مدافعت اسلام کی اصطلاحوں کو اپنے مقاصد میں شروع ہی سے شامل کرلیا۔

حسن معانی و مطالب کو خوب تر بنانے میں ظاہر ہے حسنِ ادا کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ اسی لیے ندوۃ العلماء نے جب ایک دارالعلوم کو وجود میں لانے کا ارادہ کیا تو اس کے نصاب میں پہلی بار زبان و ادب پر اتنی ہی توجہ کی گئی جو دوسرے اور مضامین علومِ اسلامیہ کو حاصل تھی۔ ادب کے مضمون پر خاص توجہ کا مقصد یہ احساس تھا کہ ادب ہی وہ ذریعۂ اظہار ہے جس سے رجحانات و ترجیحات کے ساتھ فکر و عمل اور اخلاقیات انسانی کو تحریک ملتی ہے۔ یہ بات اور ہے کہ محرکات میں امکانات دونوں طرح کے ہوسکتے ہیں، یعنی ان میں افادیت بھی ہوتی ہے اور ضرر کا اندیشہ بھی۔ تعمیر و تخریب دونوں کی راہیں اسی ادب یا زبان و بیان کی سحر آگین قوت اور توانائی سے کھل جاتی ہیں یا کھل سکتی ہیں۔ عجب معاملہ ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں مذہبی ادب ہمیشہ نہایت مؤثر بیانی قوت کی شکل میں دیکھا گیا لیکن اس کو وقت کے اسلوب اور فطری طور پر بدلتے ہوئے ذوق و مزاج سے ہم آہنگ نہ کیے جانے کی شعوری کوششوں سے بے فیض بنا دیا گیا، اسی بے فیضی نے حقیقی ادب کو اس طرح محدود و مقید کردیا کہ اس کی غیر موجودگی میں ادب کے اصل مقصد سے چشم پوشی کرنا ان لوگوں کے لیے زیادہ سازگار حالات کا سبب بن گیا جو انسانی خیر، انسانی مسرت اور انسانی افادیت کی جگہ تخریب، ذہنی انتشار، انسان کی زندگی کی اصل منزل سے دوری اور بے راہ روی کے فلسفوں کے دلدادہ تھے اور لذت اندوزی اور نفس پرستی کے غیر انسانی رویوں کی وکالت ہی میں جن کی مادّہ پرستانہ سوچ کی تسکین کا سامان تھا۔

ادب کی سچی روح کو جراحت پہنچانے کا یہ رویہ دیکھا جائے تو صرف تہذیب جدید ہی کا نہیں، انسانی معاشرہ میں نیک دید کی ازلی کشمکش کا نتیجہ ہے۔

ندوۃ العلماء کی تحریک نے دورِ جدید کی تشکیل میں ان مادّی عناصر کی تباہ کاریوں پر نظر رکھنے کی توفیق ربانی کی ارزانی جس طرح کی اور خصوصاً اردو ادب کے اس نئے دور پر نظر رکھی جو میر و غالب اور ان کے عہد کے بلند ترین شعری مقامات کے بعد نثر میں شبلی و حالی اور آزاد و نذیر احمد کے کامیاب ترین افادی ادب کا تھا جو بعد کے تغیرات و انقلابات کی کچھ بے سمتیوں کا اشارہ کررہا تھا اور جس کا اظہار ادب کے نام پر مختلف رجحانوں، نظریوں اور نامانوس اور جدید کے نام پر بے ادبیوں کی شکل میں ہوتا بھی رہا۔ اور جس کی وجہ سے کئی نسلیں ادب کی اس جدید عشرت و لذت میں ادب کی حقیقت کے ادراک ہی سے محروم ہوتی گئیں اور لطف یہ کہ ان کو احساس زیاں تک نہ رہا۔ ان کا ذوق و ذہن اس سچائی کو قبول کرنے ہی کے لیے تیار نہیں تھا کہ خیر پسندی، تقویٰ و پاکیزگی، ضبط نفس جیسی خوبیاں یا صفات کا گزر اور اثر ادب میں بھی ہوسکتا ہے۔

ندوہ نے ذہن ومذاق ومزاج کی تعمیر وتزئین کے لیے ادب کی اہمیت کو جس طرح پیشِ نظر رکھا وہ اردو ادب عالیہ میں صاف نظر آتا ہے، جس کی ایک مثال دارالمصنفین کا دبستاں ہے جو اصلاً دبستانِ ندوہ کا نمائندہ ہے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا عبدالسلام ندویؒ، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، یہ چند نام تو روشنی کے وہ مینار ہیں جنھوں نے ادب کے نام پر برپا ہونے والے طوفانوں کا رخ بدلنے میں کئی کئی نسلوں کو صحیح رخ پر ڈالنے کا فریضہ انجام دیا۔ لیکن تشہیر واشتہار اور ماڈی وسائل کی فراوانی اور ادب ناشناس ماحول کی آلودگی، آسانی سے دور ہونے والی نہیں تھی اور نہ ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر ندوہ اور خاص طور پر ندوہ کے مقاصد کی تجدید کا مبارک فریضہ انجام دینے والے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے جب نہایت جرأت وعزیمت کے ساتھ یہ صدا دی کہ حقیقی اور فطری ادب بن ہی نہیں سکتا جب تک کہ اس کے اندر مذہبی حقائق پر ایمان نہ ہو اور دل کے اندر کچھ درد نہ ہو، ندوہ کا دعویٰ تو نہیں لیکن زمانہ کی گواہیاں ضرور ہیں کہ یہ ندوہ کی عملداری تھی جس نے جو ہر وحسرت اور امجد واقبال جیسے شاعروں، صحافیوں اور آزاد و ماجد جیسے ادیبوں اور انشا پردازوں کو اپنی فتوحات میں شامل کرلیا۔ غالب وداغ اور جلال ومیر کے معاً بعد اگر شاعری کی زبان میں یہ کہا جانے لگے کہ ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصود ہنر سوزِ حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا

تو کہیں نہ کہیں ندوہ کے تعلق سے یہ چند باتیں اس لیے بطورِ تمہید قلم کی زبان پر آجاتی ہیں کہ رابطہ ادب اسلامی یا دوسرے لفظوں میں ندوہ کے بنیادی مقصد کی ترویج کے ایک شعبہ نے ادبِ اسلامی کے نام سے قریب نصف صدی سے جو کاوشیں جاری کر رکھی ہیں، ان کی ایک تصویر رابطہ کا ترجمان رسالہ کاروانِ ادب ہے۔

کاروانِ ادب کا پہلا شمارہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی سرپرستی اور حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی ادارت میں ۱۹۹۴ء میں شایع ہوا تھا۔ اس وقت اس کی مجلسِ مشاورت میں پروفیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، پروفیسر مولانا عبداللہ عباس ندوی، پروفیسر حبیب الحق ندوی جیسے اساطین علم وفضل شامل تھے۔

علم وادب کا یہ کارواں شان سے گرم سفر رہا، اس کے ہر شمارہ سے ادب اسلامی کی کرنیں بکھرتی رہیں، لیکن بعض ناگزیر حالات اور اسباب کی وجہ سے اس کی اشاعت میں تسلسل نہیں رہا تاہم اس کی اشاعت یکسر رکی بھی نہیں، ۲۰۲۰ء میں اس کی ستائیسویں جلد کے شمارہ نمبر تین کے بعد ایسے حوادث بلکہ مصائب پیش آئے جن کی زد میں اردو صحافت بھی آگئی، بہت سے رسالوں کی اشاعت ہی رک گئی۔ خود رابطہ ادبِ اسلامی کے کارواں کی رفتار میں رکاوٹیں آتی گئیں۔ ہمارے مولانا اور رابطہ کے سرچشمۂ فیض مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کو اس کمی کا شدید احساس تھا اور ان کی ہر گفتگو میں دل کا یہ درد ضرور زبان پر آجاتا کہ رابطہ کے سیمیناروں کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری ہونا چاہیے اور کاروانِ ادب کو اب نئی زندگی ملنی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ابتلا اور آزمائشوں کے موجودہ ماحول میں ندوہ کے ذمہ داروں نے کاروانِ ادب کی اشاعت پر توجہ دی اور اب یہ شمارہ اسی توجہ کے نتیجے میں آپ کے سامنے ہے۔

خدا کرے یہ ادب اسلامی کے معماروں اور اردو ادب کو پاکیزگی اور تقدس اور مسرت وافادیت اور حسن وخیر کو نئے انداز سے سنوارنے والوں کے مقصد ومعیار کے مطابق خدمت کرنے کا عمدہ، مفید اور مستقل ذریعہ بن جائے۔ آمین!

خداوندا تجھی سے چاہتے ہیں ہم مددگاری

مولانا محمد عرفان ندوی (گوپامئو)

خداوندا تجھی سے چاہتے ہیں ہم مددگاری
تجھے آتی ہے اپنے آرزومندوں کی دلداری

رحم فرما، ذرا ہم پر، کہ رُسوائے زمانہ ہیں
ہدف ہیں نفس وشیطاں کے، خطا کا شاخسانہ ہیں
ہلاکت خیز دنیا میں، تباہی کا نشانہ ہیں
جھکائے سر، تری درگاہ میں ہم عاجزانہ ہیں
بڑھی ہیں دھڑکنیں دل کی، بڑھی دنیا سے بیزاری

خداوندا تجھی سے چاہتے ہیں ہم مددگاری
تجھے آتی ہے اپنے آرزومندوں کی دلداری

تو واحد ہے، احد ہے، شان تیری بے نیازی ہے
خطائیں درگزر کرنا تری بندہ نوازی ہے
جہانِ رنگ وحرف وصوت، تیری کارسازی ہے
خطا کاروں کی توبہ سے سنا ہے تو بھی راضی ہے
تری عظمت کے آگے سر بہ خم ہیں، خوف ہے طاری

خداوندا تجھی سے چاہتے ہیں ہم مددگاری
تجھے آتی ہے اپنے آرزومندوں کی دلداری

پکڑ کرتا ہے شدت سے، تجھے قہار کہتے ہیں
بڑائی زیب دیتی ہے، تجھے جبار کہتے ہیں
چھپاتا عیب سب کے ہے، تجھے ستار کہتے ہیں
خطائیں بخش دیتا ہے، تجھے غفار کہتے ہیں ہے
ہے بالا تر گناہوں سے ترقی یہ شان بجفاری

خداوندا تجھی سے چاہتے ہیں ہم مددگاری
تجھے آتی ہے اپنے آرزومندوں کی دلداری

تو قادر ہے ہر اک شئے پر، تری ہی حکمرانی ہے
تجھی سے موج طوفاں ہے، سمندر میں روانی ہے
تو جلوہ گر ہے ہر شے میں، عجب تیری کہانی ہے
یہ آہیں ہیں ترے در پر، یہ اشکوں کی روانی ہے
بڑی ہی رحم کے قابل ہے میری گریہ وزاری

خداوندا تجھی سے چاہتے ہیں ہم مددگاری
تجھے آتی ہے اپنے آرزومندوں کی دلداری

سرِ تسلیم خم ہے بارگا و رب عزت پر
فقیر بے نوا، عرفاںؔ جھکا ہے، باب رحمت پر
ہے شرمندہ، پشیماں کس قدر، دامان دولت پر
لگی ہے ٹکٹکی اِس کی، در عفو و کرامت پر
بدن لرزاں ہے اس کا، انفعالی کیفیت طاری

خداوندا تجھی سے چاہتے ہیں ہم مددگاری
تجھے آتی ہے اپنے آرزومندوں کی دلداری

۞۞۞

نواب صاحب چھتاری خطوط کے آئینہ میں

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

میری اور سعید الملک نواب حافظ سر احمد سعید خاں آف چھتاری کی عمر اور حیثیت اور مشاغل میں اتنا تفاوت اور اختلاف تھا کہ میرا ان کے حلقہ احباب اور معاصرین میں شریک ہونا ایک بعید از قیاس اور غیر معمولی بات تھی، میں ان کا تذکرہ ایک خاندانی رئیس و نواب کی حیثیت سے سنا کرتا تھا، جو اپنی تمام دنیادی سربلندیوں، اعزاز اور وجاہت کے ساتھ جو اس دور کے کسی مسلمان رئیس کو انگریزی اقتدار میں حاصل ہوسکتی تھی اپنی اسلامیت کو قائم رکھتے ہوئے حفظ قرآن کی دولت کو نہ صرف سینے میں محفوظ کیے ہوئے بلکہ لندن کے قیام اور لکھنؤ اور نینی تال کے گورنمنٹ ہاؤس میں اس کے رمضان مبارک میں سنانے کا معمول جاری رکھے ہوئے اور علمائے حق سے محبت وعقیدت کا رشتہ قائم کیے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی سب سے پہلے اس وقت زیارت کی جب کہ وہ یوپی کے گورنر تھے اور ۱۹۳۴ء کی کسی تاریخ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے تشریف لائے تھے اور اس تقریب میں ایک جلسہ ترتیب دیا گیا تھا جس میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی بھی شریک تھے۔ میرا علی گڑھ بار بار جانا ہوتا تھا اور حبیب منزل میں جو نواب صاحب کی کوٹھی کے پہلو میں ہے اپنے بزرگ و مخدوم نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی کی خدمت میں حاضری دینا ضروری تھی، لیکن کبھی نواب صاحب کی خدمت میں حاضری کی بات نہیں آئی، نہ ان سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا۔ یہ ہم کلامی ایک مرتبہ ٹیلیفون پر ضرور ہوئی اور اس کی ضرورت یہ پیش آئی کہ ندوۃ العلماء مالی مشکلات کے دور سے گزر رہا تھا اس کو نظام ٹرسٹ سے جس کی کمیٹی کے نواب صاحب صدر تھے رجوع کرنے کی ضرورت پیش آئی، حیدرآباد کے دوستوں نے بتایا کہ نواب صاحب اس کے ایک ٹرسٹی اور اس کمیٹی کے ایک باا‌ثر رکن ہیں آپ ان کو متوجہ کریں، میں نے ٹیلیفون پر ان سے گفتگو کی اپنا تعارف کرایا اور اس مسئلہ میں ان سے مدد کی درخواست کی، انھوں نے بڑی خوش اخلاقی اور فراخ دلی کے ساتھ وعدہ فرمایا اور آمادگی ظاہر کی اور اس کا جلد ایفا بھی ہوگیا۔

میری ان کی پہلی رو در رو ملاقات اس وقت ہوئی جب ۸۰ء کی کسی تاریخ کو وہ میری علی گڑھ کی قیام گاہ ڈاکٹر ابرار مصطفی خان کے بنگلہ پر فیصل ایوارڈ کے اعزاز پر مجھے مبارک باد دینے کے لیے بنفس نفیس تشریف لائے اور اس پر اپنی بڑی مسرت کا اظہار کیا، میں شرمندہ بھی ہوا اور ان کی کریم النفسی اور عالی ظرفی سے متاثر بھی، کہ اس وقت نواب صاحب کی عمر ۹۱-۹۲ سال سے متجاوز تھی، یہ ملاقات میرے لیے اپنی بعض تصنیفات کے پیش کرنے کی تمہید بن گئی، اس سے پہلے میں ان کی آپ بیتی (خودنوشت سوانح عمری) کا مطالعہ کر چکا تھا مجھے اندازہ تھا کہ وہ اردو زبان وادب کا پاکیزہ ذوق

رکھتے ہیں اور کم سے کم طبقہ رؤسا کے اہل قلم کی (نواب صدر یار جنگ کو مستثنیٰ کر کے کہ وہ عالم وادیب وصاحب طرز انشا پرداز تھے) صف اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ میں نے ان کی خدمت میں تازہ تصنیف ''پرانے چراغ'' کی دوسری جلد جو تازہ تازہ شائع ہوئی تھی بھیجنے کی جرأت کی اس کے کچھ عرصہ بعد ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کا چوتھا حصہ جو حضرت مجدد الف ثانی کے حالات سے مخصوص ہے بھیجا، نواب صاحب کا ان دونوں کتابوں کی رسید اوران پر اپنے تاثرات کے اظہار کے سلسلہ میں جو خط آیا وہ ان کے نہ صرف ادبی ذوق بلکہ ان کی دینی اور باطنی کیفیات کا بھی آئینہ دار ہے، اس کتاب کے آخری مضامین میں میرا اپنی مرحومہ ہمشیرہ سیدہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ مصنف ''زادسفر'' پر بھی ایک موثر اور دل دوز مضمون تھا جو خاص کیفیت اور قلبی تاثر کی حالت میں لکھا گیا تھا اس میں ان کے دعاومناجات کے چند اشعار بھی بطور نمونہ پیش کیے گئے تھے جو دردواثر میں ڈوبے ہوئے تھے اور ایک ٹوٹے ہوئے شیشۂ دل کی صدا تھی، ان میں سے چند اشعار یہ تھے ۔

کنج قفس سے بات اپنا ہے آشیانہ
اس قید بے کسی میں گزرا ہے زمانہ
مغموم دل پہ یارب لازم ہے رحم کھانا
کرتی ہوں میں شکایت تجھ سے یہ عاجزانہ
بار الم ہے دل پر طاقت نہیں ہے دل میں
کیوں کر ہو صبر مجھ سے ہمت نہیں ہے دل میں

اوراس نظم کے خصوصاً یہ دو شعر تو بہت ہی درد انگیز اور پرسوز ہیں:۔

کب سے لیے کھڑی ہوں میں کاسہ گدائی
اب تک ملا نہ مجھ کو اور شام ہونے آئی
بندہ نواز ! میری منت کی لاج رکھ لے
میری نہیں تو اپنی رحمت کی لاج رکھ لے

نواب صاحب خاص طور پران اشعار کو پڑھ کر بڑے متاثر ہوئے اور انھوں نے اپنے تاثر کا بے تکلف اظہار کیا جس سے اندازہ ہوا کہ ان کو دعاومناجات سے اوراس دولت خداداد سے بھی (جو فقراء اور اہل دل کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے) حصہ ملا تھا، اس خط کو پڑھیے اور اس قسمت وسعادت پر رشک کیجیے کہ اس دولت و امارت کے ساتھ اللہ نے اپنے ایک بندے کو انابت وتوفیق دعا اور سارے اسباب مسرت وسکون کے ساتھ دل شکستگی کی دولت بھی عطا فرمائی تھی، **ذلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء۔**

راحت منزل، علی گڑھ

مخدومی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

جناب کا عطیہ ''پرانے چراغ'' تو عرصہ ہوا ختم کر چکا ہوں، اور اب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' قریب ختم ہے، یوں تو ''پرانے چراغ'' اردو ادب کے جواہر سے بھری ہوئی ہے، لیکن مجھے جتنا روحانی نفع آپ کی ہمشیرہ صاحبہ مرحومہ کے تذکرہ سے ملا وہ میرے لیے بڑی نعمت ہے اور مجھے اس سے بارگاہ الٰہی میں التجا کرنے کا طریقہ آ گیا، خاص کر جو چند اشعار تذکرہ کے آخر میں ہیں، وہ ایک زخمی دل کی آہ ہیں کہ جس سے دریائے رحمت جوش میں آتا ہے۔ وہی قلب مخزوں کی آواز ہے جس سے باب رحمت کھلتا ہے اور یہی وہ فریاد ہے کہ جس کے واسطے ''اجابت از درحق بہر استقبال می آید'' میری درازعمر میں مجھے کئی ایسے موقع آئے ہیں کہ باری تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے راہ ہدایت دکھائی ہے، کبھی انتہائی شفقت کے ساتھ ایک بار جب کہ میں لندن میں تھا ایسی تنبیہ فرمائی کہ مجھے اس خواب کی

حالت میں یقین کامل تھا کہ وہ لحہ میری زندگی کا آخری لحہ تھا، میرا تمام جسم پسینہ میں بھیگ گیا تھا اور میں کانپ رہا تھا، آپ کا وقت ان پرانی کیفیات کو تفصیل لکھ کر ضائع کرنا نہیں چاہتا لیکن میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے ''پرانے چراغ'' بھیج کر مجھے دعا کرنا سکھا دیا۔ جزاک اللہ۔

میں مبلغ پانچ سو روپیہ کا چک زکاۃ کی مد سے بھیج رہا ہوں تاکہ غریب طلبا کی مدد کی جاسکے اور دعا کرتا ہوں کہ باریٔ تعالیٰ ذاتِ گرامی کو عرصۂ دراز تک قائم رکھے، میں اپنی عمر کے بانوے (۹۲) سال ختم کر چکا ہوں اور اس کی رحمت کا منتظر ہوں

ہو چکی شام شفق باقی ہے''

آپ کا نیاز مند

احمد سعید

یکم فروری ۸۱ء، علی گڑھ

تقدیری بات اور نواب صاحب کے خلوص کا کرشمہ، کہ مجھے یہ خط حرمین شریفین کے قیام کے دوران مکہ معظّمہ میں ملا، اس خط کو پڑھ کر مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں نے مقام ابراہیم کے قریب ان کے لیے خصوصیت سے دعا کی، اور یہ سمجھتے ہوئے کہ اس سے وہ بہت خوش ہوں گے، میں نے اس کی اطلاع دینی بھی مناسب سمجھی کہ ہر صاحب ایمان کا اس پر مسرور ہونا قدرتی امر ہے کہ اس کے لیے ایسے مقام قرب ومقبولیت میں دعا کی جائے۔ ع

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے جو اس محفل میں ہے

اور نواب صاحب کو اپنے بزرگ دادا اور مربی نواب محمود علی خاں صاحب کی وجہ سے جو حرمین شریفین ہجرت کے خیال سے چلے گئے تھے لیکن پھر شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحبؒ مہاجر مکی کی ہدایت پر اپنے ہونہار پوتے کی تربیت کے لیے جس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا ہندوستان بھیجے گئے حرم مکی سے موروثی تعلق اور قلبی وابستگی تھی، نواب صاحب نے اس خط کو پڑھ کر جو خط لکھا اس نے اس خیال کی تصدیق کر دی ان کا یہ خط درج کیا جاتا ہے:

''مکرمی ومخدومی مولانا ابوالحسن علی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ میری خوش نصیبی ہے اور باریٔ تعالیٰ کا کرم ہے کہ میرا خط جناب والا کو اس وقت ملا جب آپ کا قیام مکہ مکرمہ میں تھا، اور آپ نے اپنے کرم سے میرے واسطے مقام ابراہیم کے قریب دعا فرمائی، مجھے یقین ہے کہ آپ کی دعا میرے واسطے ضرور مقبول ہوئی، یہ بھی تو ممکن تھا کہ میرا خط دفتر میں آپ کے انتظا میں روک لیا جاتا لیکن باریٔ تعالیٰ کا کرم ہے کہ وہ آپ کو اس وقت اور اس جگہ ملا جہاں اس کی رحمتوں کی بارش ہر وقت ہوتی رہتی ہے، میں تہ دل سے آپ کے کرم کا مرہون منت ہوں۔

جناب والا کی ہمشیرہ مرحومہ کی مناجات کا وہ شعر کہ جس میں یہ کہا گیا ہے کہ گناہوں کی لاج نہیں تو اپنی رحمت کی لاج رکھ لے۔ مجھے دعا کے وقت یاد آجاتا ہے خدا اپنے کرم سے باوجود میرے گناہوں کے میری لاج دنیا اور آخرت میں رکھ لے۔ آمین!

آپ کا نیاز مند

احمد سعید

۱۷/مارچ ۸۱ء، علی گڑھ

غالباً میں نے ''پرانے چراغ'' کا پہلا حصہ نہیں بھیجا تھا اس کے سلسلہ میں نواب صاحب کا ایک دوسرا خط بھی ہے جو ۸/نومبر

۸۱ء کا لکھا ہوا ہے وہ بھی یہاں نقل کیا جاتا ہے جس سے خاص طور پر ان کے ادبی ذوق اور تحریر کی شگفتگی کا اظہار ہوتا ہے:

مکرمی و محترمی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ برکاتہ

جناب والا کا عطیہ ''پرانے چراغ'' باعث شکر و امتنان ہوا۔ ایک چراغ سحری کے لیے اس سے بہتر اور بے بہا تحفہ کیا ہوسکتا ہے؟ عمر کی ۹۲ ر سال کی منزل پر انیس کا یہ شعر حسب حال ہے کہ ؎

انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ

چراغ کو لیے کہاں، سامنے ہوا کے چلے

جن حضرات کا ذکر آپ نے ''پرانے چراغ'' میں کیا ہے ان میں کئی مرحومین ایسے ہیں جن سے نہ صرف نیاز حاصل تھا بلکہ قلبی تعلق تھا اور رشید احمد صدیقی صاحب سے تو بالکل ایسے مراسم تھے کہ جیسے ہم دونوں ایک خاندان کے افراد ہیں ''پرانے چراغ'' پڑھنے میں دل کو عجیب کیفیت ہوئی نہ صرت عمر رفتہ کو آواز دینے لگا بلکہ کبھی کبھی یہ محسوس ہوا کہ عمر رفتہ نے بھی لبیک کہا اور بیتے دن پھر آگئے، پرانی یادوں کے ساتھ وہ پرانی فضا بھی آگئی اس قدر دلکش اور فکر انگیز اردو تحریر یا تقریر دیکھنے اور سننے کا کہاں موقع ملنا ہوا ''مدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے''۔

باریٔ تعالیٰ ذات گرامی کو عرصۂ دراز تک مسلمانوں کی رہنمائی کے واسطے قائم رکھے۔ آمین!

جناب والا کا گرامی نامہ صادر ہوا، میں معذرت خواہ ہوں کہ ''پرانے چراغ'' کے عطیہ کی رسید بوجہ ناسازی مزاج نہ جاسکی اب طبیعت بہتر ہے۔

دعا گو

احمد سعید

۸ر۱۱ر ء، علی گڑھ

نواب صاحب کا ایک خط اور نقل کیا جاتا ہے جس پر تاریخ نہیں ہے اور وہ ''تاریخ دعوت و عزیت'' جلد چہارم سے متعلق ہے، مجھے معلوم ہوا تھا کہ نواب صاحب کے مورث اعلیٰ جن کی نسبت سے یہ خاندان لال خانی کہلاتا ہے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے اس خط میں اس نسبت کا اثر و برکت نمایاں ہوا۔ مکتوب حسب ذیل ہے:

مکرمی و مخدومی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

جناب والا کا عطیہ ''تاریخ دعوت و عزیمت'' سے مستفید ہوا، بہت سی پرانی یادیں پھر تازہ ہوگئیں، اکبر کی ملحدانہ کوشش کو پڑھ رہا تھا کہ یکا یک یاد آیا کہ ایک بار جب میں U.P کی حکومت سے وابستہ تھا تو آگرہ گیا تھا اور سکندرہ اکبر کی قبر پر بھی جانے کا موقع ملا۔ میں اصل قبر پر جو نیچے کے حصہ میں تھی گیا، وہاں اندھیرا تھا، اور میں نے دیکھا کہ چند چمگادڑ رہنے لگی تھیں، باہر آیا تو یہ رباعی یاد آئی۔

آن قصر کہ بہرام در و جام گرفت

روبہ بچہ کردد شیر آرام گرفت

بہرام کہ گور گرفتے داریم

امروز نگر کہ گور بہرام گرفت

مجھے بڑی عبرت ہوئی، کچھ روز بعد جب میں اورنگ آباد حضرت اورنگ زیب کے مزار پر حاضر ہوا تو دستار اور بکلوس لگا کر گیا، جوتیاں چھوڑ کر کپڑے کی جوتیاں بھی پہن

کو قبر تک گیا اور فاتحہ پڑھی، لوگ وہاں اب بھی شاہی آداب کے ساتھ جاتے ہیں، میں دونوں قبروں کے اس تضاد سے بہت متاثر ہوا۔

وحدۃ الوجود کا مسئلہ ایسا ہے کہ مجھ جیسے شخص کو اس پر لب کشائی نہ کرنا ہی مناسب ہے، مجھے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خطوط کا اقتباس پڑھ کر بہت تسکین ہوئی، دو الفاظ میں بہت کچھ کہہ دیا۔ ’’نہ بودن اور ہے اور نہ دیدن اور ہے۔‘‘ اگر بدعت، اور ایسے مسائل کے خلاف حضرت مجدد الف ثانیؒ نے آواز اٹھائی ہوتی تو ہندوستان جیسے ملک میں جہاں صدیوں سے بت پرستی کا رواج ہے، بت پرستی کا جواز ہو جاتا۔ میں اس طویل عریضہ کی معافی چاہتا ہوں۔ ایک چک مبلغ ۴۰۰ روپیہ کا غریب طلبا کی خدمت کے لیے روانہ کرتا ہوں یہ زکاۃ کی رقم ہے۔

نیاز مند

احمد سعید

یہ چند خطوط جو راقم سطور کے خیال میں کسی تبصرہ وتعلیق کے محتاج نہیں بڑے فطری انداز سے صاحب مکتوبات کے قلب وذوق کی پاکیزگی، زبان ودل کی رقت ونزاہت اور علم وادب سے طبعی مناسبت کی ترجمانی کرتے ہیں، چنانچہ اس بارے میں اپنی طرف سے کچھ کہنا غیر ضروری تکلف معلوم ہوتا ہے۔ اسی خیال سے پیشِ نظر مضمون میں ان خطوط کو قارئین کے سامنے رکھ دینا ہی کافی سمجھا ہے کہ جمال فطرت رنگ آمیزی سے بے نیاز ہوتا ہے ؏

روئے دل آرام را حاجت مشاطہ نیست

❁❁❁

فغانِ نیم شب

جناب پروفیسر ہارون الرشید

وہ نورِ لامکاں ہے اور میں ہوں
جہانِ بیکراں ہے اور میں ہوں

ملی ہے ذکر کی لذت کچھ ایسی
سرورِ جاوداں ہے اور میں ہوں

جبیں کو مل گیا ہے ذوقِ سجدہ
وہی اک آستاں ہے اور میں ہوں

کرشمہ ہے فغانِ نیم شب کا
سکوتِ بیکراں ہے اور میں ہوں

نوائے شوق کا اک سلسلہ ہے
وہی اک داستاں ہے اور میں ہوں

اُسی سے گفتگو شام وسحر ہے
وہ میرا رازداں ہے اور میں ہوں

فراغت مل گئی فکرِ جہاں سے
وہ میرا مہرباں ہے اور میں ہوں

❁❁❁

خطبۂ صدارت

برائے سیمینار رابطہ ادب اسلامی بعنوان ادبِ اطفال

(منعقدہ جامعۃ الفیصل بجنور بتاریخ ۳-۴/نومبر ۲۰۱۸)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو صرف ایک عام مخلوق کی حیثیت سے وجود نہیں بخشا، بلکہ اُسے بہت متنوع اور جامع خصوصیات کی مخلوق بنایا اور اس کو وجود بخشا، صرف ''کن فیکون'' کے حکم سے نہیں پیدا کیا۔ اس طرح وہ ایک قطرے سے ترقی کر کے جسمانی طاقت و حیثیت کا انسان بنا۔ اِس طرح انسان کی تشکیل بتدریج سبب مسبب کے طریقے سے ہوئی۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تدریجی تشکیل کا مقررہ نظام جاری ہوا۔ اس میں انسانی زندگی کے شروع کے بیس سالوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اِس میں یہ ابتدائی عمر کا انسان زندگی کے لازمی حقائق سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔ اس حصولِ معلومات میں ان افرادِ خاندان اور پڑوسی افراد کی جن میں وہ رہتا اور ان سے واقفیت اور رہنمائی حاصل کرتا ہے، بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ وہ فطری انداز میں اس کو قبول کر لیتا ہے اور اپنی زندگی کا جز بنا لیتا ہے۔ یہ عمل بالکل شروع میں صرف سننے اور دیکھنے کے مواقع سے، پھر تعلیم و عملی رہنمائی کے ذریعے سے ہوتا ہے۔

تعلیمی عمل میں ایک موقر ذریعہ ادبی ذریعہ بھی ہوتا ہے کہ بات ایسے اسلوب و انداز میں کہی جائے کہ سننے والے کے دل کو لگے۔ یہ بات مخاطب کی نفسیاتی کیفیت اور الفاظ کی اثر پذیری کی رعایت کے ساتھ کہے جانے سے انجام پاتی ہے۔ اس کو انجام دینے کے لیے اہتمام کرنا ہوتا ہے جو بڑوں کے لیے ہے۔ اور بچوں اور کم عمروں کے لیے ان کی ذہنی صلاحیت و فہم کا لحاظ کرتے ہوئے سمجھانے کے اندازِ کلام کی رعایت کرتے ہوئے کرنا ہوتا ہے۔

ہندستان میں گذشتہ دو صدیوں میں اس انداز کا لحاظ کرنے والے متعدد کامیاب افراد نمایاں ملتے ہیں۔ ان کی تحریری کوششوں سے جو ادب تیار ہوا، اُس نے اُس وقت کے نشو و نما پانے والے بچوں و کم عمروں پر اچھا اثر ڈالا۔ اس طرح ہماری گذری ہوئی صدی میں اچھے نوجوانوں کے اچھے دینی رجحانات کے افراد تیار ہوئے۔ ان کی کوششیں اور کاوشیں ایسی ہیں کہ ان سے موجودہ عہد میں بھی ہم فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ لہٰذا ہمارا یہ سیمینار ان کی کوششوں کو سامنے لانے کے مقصد سے منعقد ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ وہ اس سلسلے میں رہنمائی کا ذریعہ ہوگا۔

حضرات! زبان کو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے کو سمجھنے سمجھانے کا بڑا کامیاب ذریعہ بنایا ہے، اور اس کی صلاحیت میں انسان کو دوسری زمینی مخلوقات پر زبردست فوقیت عطا کی ہے۔ یہ اس کی علمی و اجتماعی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے اور اخلاق و کردار کو قوتِ افادیت عطا کرتی ہے۔ اس کے بغیر انسانی زندگی کی نہ تو لازمی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں اور نہ مطلوبہ نتائج سامنے آپاتے ہیں۔ یہ

ایک انسانی ضرورت کے معاملات اور اس کے عقلی اور فطری احساسات کو دوسرے انسان تک پہونچانے کا وسیلہ بنتی ہے، اوراس طرح ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان تعلق کا خوشگوار اور حسبِ طلب واسطہ قائم ہوتا ہے، اور سماجی زندگی میں ہم آہنگی اور خیالات کے تبادلے کی صورت پیدا ہوتی ہے، یہ اس کی عام افادیت ہے۔ اسی کے ساتھ اس کی خصوصی افادیت اُس وقت سامنے آتی ہے جب اس کوفنی تقاضوں کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ یہ صورت اس کی ادبی خصوصیت کے دائرے میں آتی ہے اوراس کے ذریعے انسان صرف کسی ایک باشعور انسان کومحض انفرادی طور پر ہی نہیں بلکہ انسانوں کے مجموعوں تک مطلوبہ اثر کومنتقل کرسکتا ہے اورانسانی زندگی میں اس کی بھی طویل تاریخ ملتی ہے۔

اس کی افادیت بھی انسان کی ضرورت میں داخل ہے۔ انسانی ذہن کوکسی مخفی حقیقت یا افادیت سے واقف کرانا یا اُس کے احساسات وجذبات کے کسی صحت مندانہ تقاضے کو مددبہم پہونچانا یا حوصلہ وہمت کومہمیز لگانا یا طبیعت کی گراوٹ یا احساسات کی پستی کو دورکرنے اوراُن میں چستی پیدا کرنے کاعمل یا طبیعت کی افسردگی کو انشراح کی نعمت عطا کرنا ادیب کے صحیح اور مناسب کردار کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ سب پہلو انسان کے فطری پہلو ہیں جوانسانوں کے مختلف طبقات و اصناف اورمختلف مکاتبِ خیال سے تعلق رکھتے ہیں۔اسی کی بناپرادب کے اختیار کرنے والے انسانوں کے مختلف و متنوع مکاتبِ خیال ملیں گے، اوراس طرح ادب کا کردار ہرانسانی تعبیر میں اختیار کیا جاسکتا ہے، اس میں ذاتی و انفرادی، سماجی و اجتماعی دونوں میدانوں میں اچھے نمونے ملتے ہیں۔ مذہبی دائرہ بھی اس میں آتا ہے۔ اورادب کا آغاز دراصل مذہبی دائرے سے ہی ہوا، جب کہ انسان نے اپنے خدا کے سامنے اپنے دل کے واردات، عبدیت وسرافگندگی کا اظہار مؤثر ڈھنگ سے پیش کرنا شروع کیااور پھر بڑھتے بڑھتے زندگی کے دیگر مواقع میں ادب کے کردار کواپنایا گیاحتی کہ وہ وسیع اورمؤثر سطح تک پہنچا۔

ہمارے رابطۂ ادبِ اسلامی نے ادب کے اسی آغاز کوترقی دے کراس کی روح پرور کیفیت کوزندگی کے دیگر متنوع پہلوؤں میں تلاش کیا اور اس کو قارئین کی افادیت اور پسند کے لحاظ سے پیش کرنے کا سلسلہ قائم کیا۔اس طرح احادیثِ نبویہ کے اندر بھی اس کو تلاش کیا۔سیرتِ نبوی کے روح پرور اثر کے نمونے بھی پیش کیےاور کلامِ الٰہی کے تعلق سے جو پہلو سامنے آئے ان کو بھی پیش کیا۔

اس طرح کے موضوعات پر ہمارا رابطۂ ادبِ اسلامی اپنے قیام کے وقت سے اب تک سالانہ سطح پر ۳۷ سیمینار منعقد کر چکا ہے۔ یہ سیمینار برصغیر ہندستان کے مختلف شہروں میں اسلامی ادب کے ایسے خاص موضوعات پر منعقد ہوئے، جولوگوں کی توجہ سے عموماً مخفی رہےاورنظرانداز ہوتے رہے تھے۔اس کی افادیت اوروقت کی اس ضرورت کوسمجھنے کی کوئی خاص فکرعمومی طور پرنہیں کی جارہی تھی۔رابطۂ ادبِ اسلامی نے اپنے پروگراموں میں ادب پر غیر اسلامی اجارہ داری کوختم کرنے کی بھی کوشش کی اور منظم طور پر دنیا کے مختلف ملکوں اورمختلف زبانوں میں اصلاحی کوشش کی اوراسلامی ادب کوہی حقیقی ادب کی حیثیت سےلوگوں کے سامنے پیش کیا۔

رابطہ کے قیام و کارگزاری کی تاریخ تفصیل سے بیان کرنے کے بجائے صرف اتنا عرض کرنا مناسب ہوگا کہ گذشتہ صدی کی آٹھویں دہائی کے آغاز میں متعدد عرب فضلا کی موجودگی میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کوسربراہ بنا کر

اس کوشش کا آغاز کیا گیا اور اس کی پہلی مشاورتی میٹنگ مکہ مکرمہ میں ہوئی اور لکھنؤ میں اس کا افتتاحی بین الاقوامی مذاکرۂ علمی و ادبی منعقد ہوا جس میں بلادِ عربیہ کے ممتاز مصنفین، اہل قلم اور اصحابِ فکر جمع ہوئے، اور ہندستان کے مدارس و جامعات کی بھرپور نمائندگی رہی۔

اس وقت سے تاحیات یعنی ۱۹۹۹ء تک ان سب سیمیناروں اور مذاکراتِ ادبیہ کی سرپرستی اس کے بانی صدر حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے رہے اور مشقت اٹھا کر وہ ان پروگراموں میں شرکت بھی فرماتے اور اپنے خطبے و مقالے سے سامعین کو محظوظ فرماتے۔ انھیں کے خطبۂ صدارت سے ان سیمیناروں کا آغاز ہوتا تھا۔ اس کے بعد ۲۰۰۰ء سے یہ ذمہ داری ہم جیسوں کے ناتواں کاندھوں پر پڑی اور سالانہ سیمینار کے انعقاد کا سلسلہ جاری رہا۔ ان سیمیناروں میں بھی الحمد للہ تیس سے زائد سیمینار منعقد ہو چکے ہیں جو مختلف موضوعات پر ہوئے اور جن میں مختلف اصحابِ فکر و قلم شریک ہوئے۔

ہمارے رابطۂ ادبِ اسلامی کا یہ اصول رہا ہے کہ وہ میزبان کی طلب کو دیکھ کر وہاں سیمینار منعقد کرتا ہے۔ مولانا سراج الدین صاحب ندوی بچوں کے ادب سے متعلق عرصے سے کام کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں وہ بچوں کا ''اچھا ساتھی'' کے نام سے رسالہ بھی نکالتے ہیں، ان کی اور ان کے رفقا کی طلب کو دیکھتے ہوئے رابطے کے ذمہ داروں نے بچوں کے ادب سے متعلق سیمینار کا انعقاد ان کی میزبانی میں کرنے کا فیصلہ کیا۔

حضرات! اگر مخاطب کی سمجھ اور ذوق کی رعایت رکھتے ہوئے دل پذیر اسلوب میں بات کرنے اور اس کے قلب و دماغ کو متوجہ کرنے والے اندازِ تعبیر اختیار کرنے کو ادب کا نام دیں تو بچوں سے ان کی صلاحیتِ فہم و ذوق اور ان کو متوجہ کرنے والے اسلوب میں پیش کرنا ان کا ادب قرار پائے گا۔ اور اس طرح بچوں کا ادب نوخیز نسل کی تربیت اور ذہن سازی کا ایک بڑا ذریعہ ثابت ہوگا، اور خاص طور پر آج سے پچاس سال قبل کا زمانہ سامنے رکھا جائے جب کہ ذرائعِ ابلاغ کے نئے وسائل عام نہیں ہوئے تھے تو بچوں کا ادب بچوں کو معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ان کی ذہن سازی بھی کرتا تھا اور کر سکتا تھا۔ بچوں کا یہ ادب تحریر و گفتگو دونوں ذریعے سے وجود میں آتا اور کام کرتا رہا ہے۔ گفتگو والا حصہ عموماً محفوظ نہیں کیا جا سکا لیکن تحریری ادب مختلف نمونوں کی صورت میں خاصا محفوظ ہے۔ مولانا اسماعیل میرٹھی نے اردو زبان کی ریڈریں لکھیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ''توبۃ النصوح''، ''مرآۃ العروس'' اور ''بنات النعش'' جیسے ناول لکھے۔ اقبال نے بڑوں کے لیے شاعری کے ساتھ بچوں کے لیے بھی نظمیں لکھیں۔ ''مجموعۂ نظمِ حالی'' میں اکثریت بچوں ہی سے متعلق نظموں کی ہے اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے بھی بچوں کے ذہن و خیال کی تربیت کے لیے کہانیاں لکھیں اور بتدریج یہ کام بڑھا۔ اور کئی کئی ماہنامے بچوں کی زبان و ادب میں نکلنے لگے۔ ''غنچہ'' اور ''پیامِ تعلیم'' پرچوں نے دیگر پرچوں کے لیے راہ ہموار کی، اور ابھی ماضی قریب میں کئی مفید پرچے نکلنے لگے، مثلاً رامپور کا ''ذکری'' اور بجنور کا ''اچھا ساتھی'' اور مختلف مکاتبِ فکر سے بچوں کے رسالے نکلنے لگے اور آج بھی کئی پرانے اور کئی نئے پرچے نکل رہے ہیں۔

بچوں کے ادب کو ہم بنیادی طور پر تین خانوں میں بانٹ سکتے ہیں، ایک تو تعلیمی ادب جس میں حسنِ بیان اور سہل اسلوب کو تعلیمی مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسرا تفریحی ادب جس میں کہانیوں، قصوں اور نظموں کے ذریعے بچوں کے لیے ثقافتی تفریح کا سامان مہیا کیا جاتا ہے۔ تیسرا تربیتی اصلاحی ادب جس میں ادبی پیمانوں کا لحاظ کرتے ہوئے اخلاق و تربیت کے تقاضے سے مضمون

بیان کیا گیا ہو۔اول الذکر قسم بچوں کا ادب ان کی مختلف فنون کی درسی کتابوں میں ملتا ہے جس کے ذریعے ان کتابوں کو پڑھنا اور محفوظ کرنا بچوں کی دلچسپی کا باعث ہوتا ہے۔یہ قسم تعلیمی مقصد پورا کرتی ہے، یہ نوخیز بچوں کے تعلیمی نصاب کو ان کے لیے آسان اور زیادہ لائقِ استفادہ بنانے کا کام انجام دیتی ہے، اور جدید تعلیمی نظریات کی رو سے یہ ضروری ہے، ورنہ بچے کا ذہن نہ صرف یہ کہ درسی عبارتوں سے الجھتا ہے بلکہ بعض اوقات اس کے تعلیم ہی چھوڑ دینے کا سبب بن جاتا ہے، بچوں کے دماغ میں ایک بات اتارنا ہو تو اس بات کا لحاظ ضروری ہے کہ اس کے دماغ کی کھڑکیاں پوری طرح کھلی ہوں، وہ باہر کی ہوا لے سکتا ہو، ورنہ بات پوری طرح اس کے دماغ میں جاگزیں نہ ہوگی، جو کہ ذرا مشکل اور بعض وقت کڑوی بھی ہوتی ہے۔

بچوں کے ادب کی دوسری قسم بچوں کے لیے سب سے زیادہ پسندیدہ اور لطف کی ہوتی ہے، اس کے لیے ترغیب کی ضرورت نہیں ہوتی، بچے ذرا بھی واقف ہونے پر اس کی طرف لپکتے ہیں، اور اس کو اس طرح پڑھتے ہیں کہ اس میں مستغرق ہو جاتے ہیں، اور اس ادب میں اگر محیر العقول واقعات اور کہانیاں پیش کی جائیں تو اور بھی ان کے لیے پسندیدہ بات ہوتی ہے، لیکن مصنفین کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کو بچوں کے فائدے اور تربیت کے دائرے میں رکھیں، ان کے دماغ کے بے سود اور بے حقیقت باتوں میں مشغول ہو جانے کا ذریعہ اور سبب نہ بنیں۔کیونکہ یہ وقت جو ایسے ادب کے مطالعہ میں گزاریں گے اس کا کوئی ثمرہ ان کو حاصل نہ ہو سکے گا، بچوں کے ادب کی یہ قسم بہت مؤثر اور ذہن سازی کا بڑا ذریعہ بن سکتی ہے۔

اس ادب کو با مقصد ادب میں بآسانی تبدیل کیا جا سکتا ہے، اس کے مواد کی ترتیب اور انتخاب ایسا کیا جائے کہ وہ تربیتی ادب بن جائے، اور یہ رجحان اب جگہ جگہ اپنایا جا رہا ہے، جن میں علی العموم وطنی مقاصد، نظریاتی مقاصد اور مذہبی مقاصد کو پیشِ نظر رکھا جا رہا ہے۔یہ مفید اور تعمیری رجحان ہے لیکن اس میں بعض بعض وقت گروہی عصبیت کا رنگ اختیار کیا جاتا ہے، جو کہ مضر ہوتا ہے، مفید اور تعمیری رجحانات اختیار کرنے میں یہ کوشش ہونا چاہئے کہ تخریبی عمل سے بچا جائے، ضرورت ہے کہ صرف مثبت اور غیر اختلافی رجحان ہی کو اپنایا جائے تاکہ کم عمر کے بچوں کو ذہنی کشمکش میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھا جا سکے۔

عہدِ سابق میں تعلیمی میدان میں ادبی طریقے کا لحاظ عام طور پر ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا اور نصاب کی کتابیں مشکل اور حل طلب عبارتوں میں ہوتی تھیں، لیکن تعلیم کے موضوع پر جو تحقیق و تحسین کی کوششیں ہوئیں ان کے نتیجہ میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ درسی نصاب کی عبارتوں میں تسہیل بلکہ بچے کے ذہن کے لحاظ سے کشش کا سامان ہو، اس میں اردو کے دائرے میں مولانا محمد اسماعیل میرٹھی کا کام متعدد خوبیوں کا حامل ہے، عربی میں مصر کی ''القراءۃ الرشیدۃ'' اور اس جیسی دوسری کتابیں بھی اسی دائرے میں شمار کی جا سکتی ہیں، یہ دراصل زبان سکھانے کی کتابیں ہیں، لیکن ان میں سہل اور دل پسند و ترغیب کے اسلوب میں تاریخ اور ثقافتِ عامہ کی کتابیں بھی تیار کی گئیں۔

رہا بچوں کا تفریحی ادب تو اس میں گزشتہ مدت میں خاصا کام ہوا ہے، کہانیوں اور دلچسپ واقعات پر بہت چھوٹی چھوٹی بہت سی کتابیں لکھی گئیں اور شائع ہوئیں، جن کو بچوں نے بہت ذوق

وشوق سے پڑھا، اور یہ سلسلہ برابر قائم ہے، عربی میں بھی اس سلسلے میں خاصا لٹریچر تیار ہوا، اس میں کامل کیلانی کی کتابیں سرفہرست ہیں، لیکن اس سلسلے کا سارا لٹریچر صرف ثقافت وتہذیب کو پیش نظر رکھ کر تیار کیا گیا ہے، اس میں تربیتی مقصد شامل کردیا جائے تو یہ تربیتی لحاظ سے بہت مفید ہے۔

بچوں کے ادب کی تیسری قسم اخلاقی وتربیتی ہے، اس میں تاریخی واقعات اور خودنوشت قصوں اور کہانیوں سے بچوں کی تشکیل ذہنی اور اخلاقی تربیت کا کام لیا جاتا ہے۔

یہ ادب بامقصد ادب ہے جو بچوں کے ذہن کی تشکیل انسانی قدروں اور صالح تصورات کی بنیاد پر کرتا ہے، لیکن اس میں متوازن اور دل پسند ڈھنگ اختیار کرنا آسان کام نہیں، اس ادب کو ادب کے ہنرمند لوگ ہی نباہ سکتے ہیں، وعظ کہنا بھی آسان ہے، اور ادب کا اناپ شناپ مضمون اور بے لگام انداز بیان کے ساتھ تیار کرنا بھی آسان ہے۔ مشکل کام ہے توازن اور تناسب۔ اسی لیے اس ادب کو پیش کرنے میں سب اہلِ قلم کامیاب نہیں ہوتے، لیکن یہ بامقصد ادب انسان کی صلاحیت کے دائرے سے باہر بھی نہیں ہے، ہم کو یہ بامقصد ادب ڈاکٹر ذاکرحسین صاحب کے یہاں اور انھیں جیسے متعدد اہلِ قلم کے یہاں نظر آتا ہے، جنھوں نے اپنی تحریر سے بچوں کو وطنی لگاؤ اور انسانیت کی قدروں سے شناسا کرنے کی کوشش کی، پھر ان کی کوششوں سے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اس ادب کا رجحان ہوا، اور کام انجام پایا، اس ادب کے پیش کرنے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، دارالمصنفین اعظم گڑھ اور جماعت اسلامی کی انجمن تعمیر ادب کے ادیبوں کا بھی خصوصی حصہ رہا، ندوہ کے حلقے کے افراد کا بھی اچھا حصہ رہا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اس کا شوق ہوا، اور انھوں نے اپنی کم عمری میں ہی اس سے دلچسپی رکھی، پھر عربی زبان پڑھنے پر عربی ادب کا مطالعہ کیا اور اس میں امتیازی خصوصیت حاصل کی، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن وحدیث کا جو علم حاصل کیا اس سے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ اسلام کی ادبی تاریخ میں قرآن وحدیث کے اثر سے ادب کے میدان میں جو ستھرا اور انسانیت نواز مزاج پیدا ہوا تھا اور جس کے نتیجے میں اس مزاج کے بہت سے نمونے اس کی ادبی تاریخ میں مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں ان کو نکالنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے، پھر مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے خود اس پر کام کیا اور اسی کے ساتھ خود بھی اس مزاج کا ادب تیار کیا، اور پھر اس کو ایک تحریک بنادیا، اس سلسلے میں تقریباً یہ پہلا کام تھا۔ یہ وہ دور تھا کہ مشرقی ممالک غلامی کے اثرات سے اپنے فکر اور ادب کو نکال نہ سکے تھے، مولاناؒ کی اس دعوت کو عربوں نے قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اس سلسلے میں مولاناؒ کی پیش قدمی کو سراہا اور مولانا کی تائید کی، آج ہم اس کے ثمرے کے طور پر رابطہ ادب اسلامی کو دیکھ رہے ہیں، مولاناؒ نے ادب کے اسلامی تصور کے مطابق بچوں کے لیے بھی عربی سلسلہ تیار کیا اور اس کو بھی عربی کے ادیبوں نے بہت سراہا۔

یہ وہ دور تھا کہ بچوں کے لیے لکھی جانے والی کتابوں میں مغرب کے آزادانہ طرزِ عمل نے جانوروں اور غیر انسانی مخلوقات کے تذکرے کو بھی بچوں کی پسند اور رغبت کا موضوع بنادیا تھا اور اس کا چلن قائم کردیا تھا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو غیر مفید بلکہ مضر قرار دیتے ہوئے تحریر کیا کہ محض تفریحی اور بے بنیاد واقعات کے بجائے اخلاقی وتربیتی حکایات اور واقعات ہوں تو بچوں کی ذوقی وذہنی نشوونما کے لیے مفید ہوگا، اس سلسلے میں حکایاتی ادب کی اہمیت کو

مولانا نے واضح کیا اور تحریر کیا کہ قرآن مجید کی مختلف آیات سے بھی حکایاتی ادب کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔سورہ اعراف میں ہے: ''فاقصص القصص لعلهم يتفكرون'' سورہ یوسف میں ہے: ''نحن نقص عليك أحسن القصص'' اور مولاناؒ نے تحریر فرمایا کہ اسلامی تاریخ وادب میں اس سلسلے کا مواد سب سے زیادہ پایا جاتا ہے، مولاناؒ نے اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنایا اور بچوں کے لیے بھی پسندیدہ اور مؤثر صالح مواد پیدا کردیا، عربی میں مولاناؒ کا اس سلسلے کا کام بڑا ممتاز رہا، ''قصص النبيين للأطفال'' پہلا تا پانچواں حصہ، ''قصص من التاريخ الإسلامي'' وغیرہ ان کی تصانیف بہت مقبول ہوئیں۔اور بچوں کے ادب کی تعلیمی قسم میں بھی مولاناؒ کا بڑا حصہ ہے۔اس میں ان کی ''القراءة الراشدة'' اس سلسلے کی نہایت کامیاب کوشش ثابت ہوئی۔مصر وشام وحجاز کے بہت سے اسلام پسند ادیبوں کا بھی اس سلسلے میں نمایاں کام ہے، خاص طور پر عبدالرحمن رأفت پاشا کے کئی سلسلے اس سلسلے میں امتیاز رکھتے ہیں۔ان حضرات نے مولاناؒ کی اسی سلسلے کی سبقت کو انھیں کے ادبی سوچ کے طریقے پر چلنے والا قرار دیا ہے۔

خواتین کا بھی اچھا حصہ نظر آیا، جن میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہمشیرہ امۃ اللہ تسنیم مرحومہ کی قصص الانبیاء اور صحابہ وصحابیات کے تعلق سے ان کے کتابچے بھی ہیں۔اور جو کام برصغیر میں انجام پایا ان میں ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، مولانا مقبول احمد سیوہاروی، مائل خیرآبادی اور بہت سے اہلِ قلم ہیں جن میں مولانا سراج الدین ندوی کا کام بھی نمایاں ہے، ان کے کام کو دیکھتے ہوئے یہ سیمینار صحیح موقع اور صحیح جگہ پر منعقد ہو رہا ہے۔اللہ تعالی قبول فرمائے اور مبارک کرے اور اس کے اچھے اثرات ظاہر فرمائے۔

❁❁❁

شریعت کا یہی دل ہے

حکیم شریف احسن

شریعت کا یہی دل ہے، طریقت کی یہی جاں ہے
محبت سرورِ کون و مکاں کی اصل ایماں ہے

یہ رعنائی، یہ زیبائی جہاں میں ان کے ساتھ آئی
محبت، روشنی، عدل و وفا سب ان کا احساں ہے

وہ اونٹوں کی قطاروں کی قطاریں بخش دیتے ہیں
صداقت کی کہاوت حاتمِ طے ان کا درباں ہے

شتربانوں کو سکھلائے وہ آدابِ جہاں بانی
زمانہ آج تک ان کی جہاں بانی پہ حیراں ہے

چٹائی، چارپائی، پھوس کی چھت، کچی دیواریں
جہانِ عیش وعشرت میں یہی کچھ ان کا ساماں ہے

جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں، آساں ہو کہ مشکل ہو
جہاں دیکھا گیا ان کو وہی تصویرِ قرآں ہے

رہا تھا فرق کچھ باقی نہ انساں اور حیواں میں یہ ان
کی درس گہ کا فیض ہے، انسان انساں ہے

جہاں آرا جہاں ان کا نہیں دیکھا تو کیا دیکھا
ان آنکھوں سے انھیں دیکھوں، یہی اک جی کا ارماں ہے

بجھا سکتی نہیں ہیں آندھیاں اس شمع کو احسنؔ
جو میرے دل کے فانوسِ محبت میں فروزاں ہے

خطبۂ صدارت

برائے سیمینار رابطہ ادبِ اسلامی بعنوان

’’حضرت مولانا شاہ محمد عبدالرحیم نقشبندی مجددی: حیات وخدمات‘‘

منعقدہ جامعہ ہدایہ جے پور بتاریخ ۱۵-۱۷ نومبر ۲۰۲۴ء

مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندویؒ

الحمد لله رب العالمين و الصلاة و السلام على سيد المرسلين و خاتم النبيين محمد و على آله و صحبه أجمعين، و من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين و بعد!

حضرات! رابطہ ادب اسلامی اور جامعہ ہدایت جے پور کے اشتراک سے منعقد ہونے والے اس ادبی مذاکرہ میں ہم تہہ دل سے آپ حضرات کا استقبال کرتے ہیں، ہم آپ کے انتہائی شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہماری دعوت قبول فرما کر اس ادبی مذاکرہ میں شرکت کی زحمت گوارا فرمائی۔

حضرات! ’’جامعہ ہدایت جے پور‘‘ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہاں ۱۷-۱۸ فروری ۱۹۸۷ء میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کا دوسرا عالمی سیمینار بعنوان ’’ادب اور مغربی وادبی تحریکات‘‘ منعقد ہوا جس میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کے سابق صدر ڈاکٹر عبد القدوس ابوصالح بھی شریک ہوئے، ان کے علاوہ ملک کے مختلف تعلیمی اداروں سے پچاس سے زائد ممتاز اہل قلم نے بھی شرکت کی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقع پر ’’جامعہ ہدایت‘‘ کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا تھا کہ

’’راجستھان کی راجدھانی جے پور میں ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں جے پور شہر سے چند میل کے فاصلہ پر شاہ عبدالرحیم مجددیؒ نے اپنے جدامجد کی یاد میں ان کے نام پر ’’جامعہ ہدایت‘‘ کی بنیاد ڈالی، تین طرف سے خشک پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی سرسبز وشاداب وادی میں (جو حجاز کی پہاڑیوں اور وادیوں کی یاد تازہ کرتی ہے) دسمبر ۱۹۸۵ء میں اس جامعہ کا افتتاحی اجلاس منعقد ہوا تھا، جس میں دوسری ریاستوں کے بھی ممتاز علماء، ماہرین تعلیم ودانشور جمع ہوئے تھے، اس موقعہ پر جب اس ’’وادی ہدایت‘‘ میں راقم نے قدم رکھا تھا تو اس منظر کو دیکھ کر کہ پہاڑوں کے درمیان ایک غیر آباد علاقہ میں خدا کے ایک مخلص بندہ اور صاحب عزیمت انسان کی عالی نظری اور اولوالعزمی کے طفیل ’’جامعہ ہدایت‘‘ کی شاندار عمارت کھڑی ہوئی ہے، بے اختیار مولانا اسلم جیراج پوری مرحوم کا یہ شعر زبان پر آ گیا:

عزم ِراسخ ہے نشانِ قیس وشانِ کوہ کن
عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت وکوہسار

اب یہ وادی وادی علم وہدایت بن گئی ہے، اور جامعہ کی وسیع شاندار اور خوبصورت عمارتوں اور وہاں رہنے والے طلبہ واساتذہ کی وجہ سے جنگل میں منگل کا سماں نظر آتا ہے‘‘۔

(بحوالہ کاروان زندگی، جلد سوم، صفحہ نمبر: ۲۱۸ تا ۲۱۹)

اب جامعہ ہدایت میں یہ دوسرا اور عالمی رابطہ ادب اسلامی کا چالیسواں سیمینار ''شاہ محمد عبدالرحیم نقشبندی مجددی: حیات وخدمات'' کے عنوان پر منعقد ہورہا ہے۔ امید ہے کہ یہ سہ روزہ سیمینار بھی اسی طرح کامیاب ہوگا جس طرح سابقہ سیمنار کامیاب ہوتھا۔

حضرات! حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ادب اسلامی کا جو تصور دیا اور اس تصور کو عملی جامہ پہنا کر اس کے خدوخال کو جس طرح واضح کیا، پھر ایک تحریک بنا کر اس کو مشرق ومغرب میں عام کیا، اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں اس کام کی کتنی اہمیت تھی اور اس کام کو وہ کتنا ضروری سمجھتے تھے۔ ۱۹۳۵ء سے چلنے والی ترقی پسند تحریک کے نتیجہ میں جو نسل تیار ہورہی تھی، جو مزاج بن رہا تھا، جو ذہن تیار ہورہا تھا، ادب کے نام پر جس طرح لوگوں کو بے ادب بنایا جارہا تھا، قلم کے ذریعہ جس طرح ذہنوں کو مسموم کرنے کی کوشش کی جارہی تھی، رجعت پسندی کے خلاف نعرہ لگا کر، غریبوں، کمزوروں اور مزدوروں کی ہمدردی کی صدا لگا کر، معاشی مساوات کے جھوٹے خواب دکھا کر گمراہی اور بے راہ روی کی جس طرح دعوت دی جارہی تھی، دین، شریعت اور مقدس دینی ہستیوں کا جس طرح مذاق اڑایا جارہا تھا، اسلامی شعائر کی حرمت کو جس طرح پامال کیا جارہا تھا اور ادبی میدان کو ایک خاص طبقہ کی جاگیر قرار دے کر دوسرے طبقہ کے قلم کاروں، انشاء پردازوں اور ادب کے شہسواروں کو اس میدان سے جس طرح باہر کیا جارہا تھا۔

یہ وہ صورتحال تھی، اگر اس کا مقابلہ نہ کیا جاتا، قلم کی طاقت کو سمجھ کر اس کا صحیح استعمال نہ کیا جاتا، ادب کے ان نمونوں کو سامنے لا کر اسلامی ذہن رکھنے والے ادباء کا تعارف نہ کرایا جاتا، ادب پر بے ادب لوگوں کی اجارہ داری کو ختم نہ کیا جاتا، تو ہماری نوجوان نسل کا دین پر باقی رہنا مشکل ہوجاتا، کیوں کہ قلم کی طاقت کا جواب قلم ہی سے دیا جاسکتا ہے اور یہ طاقت ہمارے پاس اس طبقہ سے زیادہ ہے بشرط کہ اس کا استعمال کیا جائے اور قلم کو قلم سے ٹکرایا جائے، یہی وہ فکر تھی جس کی دعوت رابطہ ادب اسلامی کے بانی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہتے ہوئے دی کہ ہمارے علمی، ثقافتی اور دینی ورثہ میں ادبیات کا بڑا ذخیرہ موجود ہے جو موضوع کے علمی، دینی، فکری، اصلاحی اور تربیتی ہونے کی وجہ سے ادب میں شامل نہیں کیا جاتا جبکہ وہ اپنی دلکشی، دلآویزی اور اثر پذیری میں ادبی موضوعات پر لکھی گئی تحریروں سے زیادہ موثر نظر آتا ہے، ایسے ذخیرہ کو کھنگالنا اور ادب کے ان شہ پاروں کو جو ادب کی شرائط پوری کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی اور فنی خصوصیات کے بھی حامل ہوں، سامنے لانا یہ وقت کا تقاضہ ہے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس فکر کے صرف اظہار پر اکتفا نہ کرتے ہوئے اس کا عملی نمونہ بھی پیش کیا اور اس طرح اس کی راہ کشادہ کرتے ہوئے اس کو ایک جادۂ کارواں بنادیا، اس عمل نے عرب ادباء کو خاص طور پر متاثر کیا اور وہ مولانا کے ساتھ شریک قافلہ بنے، اس طرح عالمی رابطہ ادب اسلامی کا عمل جود میں آیا، ۱۹۸۶ء کے آغاز میں ندوۃ العلماء میں ادب اسلامی پر منعقد ہونے والے سیمینار سے رابطہ نے اپنے سفر کی شروعات کی اور الحمدللہ اس وقت سے وہ برابر سرگرم عمل ہے، ادب اسلامی کے نئے نئے پہلوؤں پر سیمینار بھی منعقد ہوتے ہیں اور سہ ماہی آرگن میں وہ شائع بھی ہوتے ہیں۔

رابطہ ادب اسلامی نے اپنی جدوجہد کے لیے تین میدان منتخب کیے، ان میں سے ایک میدان اسلامی ادب کے تعارف وتشریح کا، دوسرا میدان اسلامی رجحان کے حامل ادباء کی کوششوں کو تقویت پہنچانے کا، تیسرا میدان ادب کے ذخیرہ میں نئے اضافے کا۔

ان میں سے پہلے میدان کا کام تعارفی لٹریچر تیار کرنا، ملاقاتوں اوراجتماعات کے ذریعہ اسلامی ادب کی ضرورت کا احساس دلانا اورادب سے دلچسپی رکھنے والوں کورابطہ سے جوڑنا، یہ کام حسب استطاعت انجام دیا جارہا ہے، دوسرے میدان عمل میں رابطہ نے اپنی استطاعت کے مطابق اسلامی ادب کے کاموں اور ترجمانوں کے ساتھ تعاون کا خاصا کام انجام دیا ہے۔

رابطہ کے تیسرے اختیار کردہ میدان میں قابل ذکر کام رابطہ کی طرف سے منعقد ہونے والے علمی وادبی مذاکرات ہیں جوتقریباہر سال منعقد ہوتے ہیں، اوران میں پیش کیے جانے والے مقالات ہیں جورابطہ کے ترجمان کاروان ادب میں شائع ہوتے رہے ہیں، اوراس کے نتیجہ میں مقالات کا اچھاذخیرہ تیار ہوگیا ہے۔

متعدد اہل دل علماء کے ملفوظات کے مجموعے ادب کے بہترین نمونے شمار کیے گئے ہیں۔انھی اہل دل علماء میں شاہ محمد عبد الرحیم نقشبندی مجددی بھی ہیں جن کی حیات وخدمات پر ہمارا یہ چالیسواں سیمینار منعقد ہورہا ہے۔

حضرات! شاہ محمد عبد الرحیم مجددیؒ کا تعلق اس ممتاز سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ سے ہے جس کے سرخیل حضرت امام احمد بن عبدالاحد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، اس سلسلہ کی امتیازی شان شریعت اور سنت کی کامل اتباع ہے، اس سلسلہ کے مشائخ ایسے اولیاء، صوفیاء، اتقیاء رہے ہیں جوسنت کی پیروی، ذات رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق ومحبت، انسان کی کردار سازی اور اصلاح ودعوت کے میدان میں ممتاز ہیں۔

مولانا مجددی کی طبیعت ومزاج میں شکر، امید ونیک فالی، عالی ظرفی، عزم وحوصلہ، اثبات اوراستقامت کے جوہر نمایاں تھے۔ زندگی کے تقاضوں پر مثبت وایجابی انداز سے غور وفکر، عزم وہمت کے ساتھ نامساعد حالات سے نبرد آزمائی، صحت مند شعور، دینی غیرت وحمیت کے ساتھ دین ودنیا کی خدمت ان کا شعار تھا، ان کے عزم و حوصلہ اور بلند ہمتی کا اثر ان کی مجلس میں بیٹھنے والے پر بھی پڑتا تھااور وہ بھی اپنے اندراللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین وایمان اورعقیدت ومحبت میں اضافہ کے ساتھ امید واعتماد کی گرمی وروشنی محسوس کرتا تھا۔

مولانا مجددی بیک وقت ایک داعی تھے کہ دعوت وتبلیغ کے اجتماعات میں تقریر کرتے، ایک مصلح تھے کہ اسلاف کے طریقہ پر تزکیہ نفوس وتصفیہ قلوب کا فریضہ انجام دیتے، تعلیم وتعلم کے شیدائی و عاشق تھے کہ زیادہ سے زیادہ زیور علم سے آراستہ ہونے اورمعرفت سے سنورنے کی دعوت دیتے، آپ نے اپنے دونوں صاحبزادوں مولانا فضل الرحیم مجددی ندوی اور مولانا ضیاء الرحیم مجددی ندوی کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل کیا، انہوں نے وہاں سے فراغت حاصل کی، مولانا فضل الرحیم مجددی صاحب ندوی علمی وادبی ذوق میں امتیاز کے ساتھ دینی وملی فکرمندی میں بھی ممتاز ہیں، صاحب رائے وصاحب فکر ہیں، تعلیم وتربیت میں اپنے والد ماجد کے نقش قدم پر گامزن اوران کے مشن کوآگے بڑھانے میں کوشاں ہیں اوردوسرے صاحبزادہ مولانا ضیاء الرحیم صاحب ندوی دینی، تعلیمی اورملی میدان میں نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں، اللہ تعالی ان حضرات کی عمر میں برکت عطافرمائے اوران کی خدمات کوقبول فرمائے۔

حضرات! شاہ محمد عبد الرحیم نقشبندی مجددیؒ کی شخصیت علم وفن اورادب سے خاص لگاؤ کی وجہ سے جامعیت کا مظہر تھی، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی جن کا حضرت مجددی سے گہرا ربط وتعلق تھا۔ لکھتے ہیں: ''مولانا شاہ عبد الرحیم صاحب سے اول اول کب اور کہاں تعارف ہوا، وہ تو اس وقت حافظہ میں محفوظ نہیں ہے، لیکن اتنا ضرور ذہن میں تازہ اورنقش ہے کہ پہلی ہی

ملاقات میں ان سے ایسی مناسبت بلکہ موانست محسوس ہوئی جو اپنے خاص سلسلہ کے شیوخ یا ان برادران طریقت سے محسوس ہوتی ہے جو ایک ہی سلسلہ سے منسلک یا ایک ہی مرکز علم وفکر سے وابستہ اور اس کے تربیت یافتہ ہوتے ہیں''۔

عم محترم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ حضرت مولانا شاہ محمد عبدالرحیم صاحب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''مولانا شاہ محمد عبدالرحیم صاحب مجددی ایک بڑی دینی واصلاحی شخصیت تھے، جن سے تربیتِ دینی واصلاحِ نفس کے میدان میں بڑا فیض پہنچ رہا تھا اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ ایک ملنسار، متواضع اور جامع کمالات بزرگ تھے، ان سے جو ملتا معتقد و معترف ہوجاتا، انہوں نے اپنی صلاحیتوں سے دین وملت کی بڑی خدمت انجام دی --------مولانا رحمۃ اللہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے، زمانہ کی نبض کو سمجھتے تھے اور اپنی اسی فہم وفراست کے مطابق وہ ملت کے کاموں میں حصہ لیتے تھے اور اصلاح وتربیت کا کام کرتے تھے''۔

والد ماجد مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''شاہ محمد عبدالرحیم صاحب مجددیؒ ان نابغۂ روزگار اولیاء، صلحاء اور مصلحین میں سے ہیں جو اپنی روحانیت وللّٰہیت اور فیوض و برکات کی ضیاء پاشیوں سے دور دراز کے علاقوں کو منور اور عطر بیز ہواؤں سے دور دور تک کی فضا کو معطر کردیتے ہیں۔آپ نے اپنے فیوض وبرکات سے مخصوص علاقہ اور مخصوص جماعت ہی کو صرف ان صلحاء کی طرح فیض یاب نہیں کیا جو اپنی خانقاہوں میں مقیم رہتے ہیں اور اپنی تمام تر تربیتی کوششیں ایک ہی ایسی مخصوص جماعت پر مرکوز کردیتے ہیں جو ایک مدت تک ان کی صحبت وتربیت سے مستفید ہوتی ہے، بلکہ نہایت سرگرم عمل اور فعال مصلح ومربی تھے، آپ کے نفس گرم سے ہزاروں کے دلوں میں اجالا تھا اور خلق خدا کی ایک بہت بڑی تعداد کے قلوب میں محبت کی روشنی اور گرمی تھی، علم وعرفان کے اس گوہر شب چراغ سے ایک پورا علاقہ جگمگا رہا تھا اور سلسلہ مجددیہ کا یہ فیض دور دور تک جاری وساری تھا''۔

حضرات! ہمارے اس سہ روزہ سالانہ (۴۰ویں) سیمینار کا موضوع شاہ محمد عبدالرحیم نقشبندی مجددیؒ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی، خدمات اور وہ ملفوظات اور مواعظ ہیں جو دل پر اس طرح اثر انداز ہوتے ہیں کہ اس کی دنیا ہی بدل دیتے ہیں، زبان کی شگفتگی، بیان کی دل آویزی، جذبات کی تپش، تخیل کی بلندی، لہجہ کی مٹھاس اور محبت میں گندھی ہوئی تعبیرات، مخاطب کی رعایت، موقع کا لحاظ، الفاظ کا حسن انتخاب اور پھر اخلاص کی تاثیر ان کے کلام کو اس بلندی پر پہنچادیتی ہے جہاں ادب کی وردی میں ملبوس اور اس وردی پر ادب کے میڈل سجائے نامی گرامی ادباء بھی نہیں پہنچ سکتے۔رابطہ ادب اسلامی کا مقصد ان جیسی شخصیات کو سامنے لانا اور ان کے کلام سے لوگوں کو متعارف کرانا ہے۔

اخیر میں، ہم جامعہ ہدایت کے سربراہ اعلی شاہ فضل الرحیم نقشبندی مجددی ندوی کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اس اہم موضوع پر سیمینار کا انعقاد کیا، ہمیں امید ہے کہ اس سہ روزہ سیمینار میں حضرت مولاناؒ کی حیات وخدمات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی اور یہ سیمینار علمی، ادبی اور تربیتی لحاظ سے مفید ثابت ہوگا۔دعا کرتے ہیں کہ اس سیمینار سے علمی اور ادبی فائدہ حاصل ہو۔ ۞۞۞

سکریٹری رپورٹ

برائے سیمینار رابطہ ادبِ اسلامی بعنوان

’’حضرت مولانا شاہ محمد عبد الرحیم نقشبندی مجددی: حیات وخدمات‘‘

منعقدہ جامعہ ہدایہ جے پور بتاریخ ۱۵-۱۷ر نومبر ۲۰۲۴ء

عمیر الصدیق دریا آبادی ندوی

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد المرسلين و خاتم النبيين وعلى آله و أصحابه الطيبين الطاهرين، ومن تبعهم بإحسان و دعا بدعوتهم إلى يوم الدين، أما بعد:

محترم حضرات! رابطہ ادبِ اسلامی کے اس سیمینار میں آپ تمام شرکاء وسامعین کا دل کی گہرائیوں سے خیر مقدم ہے۔

خالقِ کائنات کی حمد وثنا اور محسنِ کائنات پر درود وسلام کے بعد رابطہ ادبِ اسلامی کے آج کے اس سیمینار میں آپ تمام حاضرین ومندوبین کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش ہے۔

حاضرین کرام! جے پور کی سرزمین رابطہ ادب اسلامی کی محفلوں سے پہلے بھی آشنا ہو چکی ہے۔ ۱۹۸۷ء میں رابطہ کے مرکز لکھنؤ میں پہلے سیمینار کے بعد یہ جے پور شہر تھا جس کو رابطہ کی اولین میزبانی کا شرف حاصل ہوا ؛’’اسلامی ادب اور مغربی تحریکات‘‘ کے عنوان سے وقت کی ایک اہم ادبی وعلمی ضرورت کی آواز یہیں سے اٹھی۔

حضرات! اردو ادب کے ممتاز ترین خطوں پر راجستھان کو یہ ترجیح محض اتفاق نہیں، راجستھان کی اہمیت اجمیر کے مولانا معین الدین اجمیری کے اس شعر سے عیاں ہے کہ:

جن کی تابانی مہ و انجم سے لاتی ہے خراج
اب بھی وہ ذرے غبارِ خاکِ راجستھاں میں ہیں

اس شعر میں ’اب بھی‘ کا بیانیہ اگر چہ گذری ہوئی بہار کی نشاندہی کے طور پر ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ راجستھان کے ریگزار ہوں یا پھر کوہسار اور ان کے درمیان انسانی قوت وصلابت اور انسان کی فطری جواں مردی اور شجاعت کی قابل رشک علامتوں کی صورت میں راجستھان کے شہر، گاؤں، قلعے ہوں یا وہ سرسبز وشاداب علاقے ہوں جن کو نخلِ آرزوئے جواں مرداں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، یہ سارے قدرت کے وہ تحفے ہیں، جنھوں نے یہاں کی فضاؤں میں نغموں، گیتوں اور عوامی قصوں اور کہانیوں کی خدا جانے کتنی دلکش روایتوں کو بکھیر دیا، پہاڑوں کی رفعتوں اور دشت وصحرا کی وسعتوں میں وہ بادِ بیابانی ہمیشہ محوِ سفر رہتی ہے جو خاموشی، دلسوزی، سرمستی اور رعنائی کی سوغاتیں تقسیم کرتی جاتی ہے۔ راجستھان کے لوک گیتوں میں سچائی اور سادگی کی یہ ایک خاص وجہ ہے۔ انھی نغموں کو جب پاک جذبوں کی زبان ملی تو زبان پر یہ حقیقت سامنے آگئی کہ ع

چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا

راجستھان نے اجمیر کے چشتی پیغام کو اپنے آس پاس جس طرح عام کیا، وہ جودھپور، الور، بھرت پور اور ٹونک جیسے شہروں کو

صدیوں سے ادب وشعر کے سانچے میں ڈھالتا آیا ہے۔

خود جے پور کے راجاؤں کی ادب نوازی خصوصاً مرزا غالب کے حوالے سے اردو ادب میں ہمیشہ یاد کی جانے والی داستان ہے، غالب اور جے پور کا موضوع غالبیات کا بڑا اہم باب ہے، میر مہدی حسن مجروح اور منشی ہر گوپال تفتہ کو اردو ادب میں حیاتِ جاودانی غالب ہی کے طفیل ملی۔ اِن کے علاوہ بیسیوں ادیب و شاعر غالب کے سلسلے سے اس طرح وابستہ ہوئے کہ راجستھان کا خطہ اودھ اور دکن جیسے مراکزِ اردو کے سامنے احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہوا، خصوصاً راجستھان کے شہر بلکہ ریاست ٹونک کا وہ علمی و ادبی مقام ہے جس کا موازنہ شیراز وسمرقند ہی نہیں، اندلس کی فردوسِ گم گشتہ سے کیا جاسکتا ہے۔

حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات خصوصاً تصوف کے رموز و اشارات نے راجستھان کے ادب کو رازستانِ تصوف بنانے میں جو کردار ادا کیا وہ بھی غور کرنے کا طالب ہے۔

اسی جے پور میں کیسے کیسے شاعر ہوئے، مثال کے طور پر احمر جے پوری کی شاعری ہے جنہوں نے ترقی پسندی کے عہد شباب میں کہا کہ:

کیا سمجھ سکتے ہیں تجھ کو عصرِ حاضر کے ادیب
کاکل و رخسار کے رنگین محفل کے نقیب
اپنے گرد و پیش پر پڑتی نہیں اُن کی نظر
مضمحل انسانیت کی کچھ نہیں اُن کو خبر
جس ادب کو زندگانی سے نہ ہو کچھ واسطہ
دوستو: ایسے ادب سے ملک کو کیا فائدہ ؟

یہاں جے پور یا راجستھان کی ادبی اور شعری محاسن سے آباد بستیوں کی تفصیل کی ضرورت ہے، نہ گنجائش۔ مختصر صرف یہ کہنا ہے کہ ادبِ اسلامی کے لیے جے پور کی سرزمین کی یہ کشش بے وجہ نہیں۔

حضرات: یہ بات بالکل واضح ہے کہ ادب کی ایک تشریح ہوتی آئی ہے۔ خصوصاً فلسفۂ یونان کے زیرِ اثر جس کو بار بار دہرایا جاتا ہے کہ ادب اِس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انسان اپنے خیالات و جذبات کو پُر اثر اور دلکش پیرایے کے ذریعے اِس طرح پیش کرے کہ پڑھنے اور سننے والے کے دل اور دماغ کے لیے اُس میں ایک خوشگوار کیفیت کا سامان ہو، یہ الگ بات ہے کہ اُس سے قلب اور ذہن بنیں یا بگڑیں، بس زبان کا لطف ہو، اسلوب کی جدت ہو اور حرف ولفظ کا نشہ ہو۔

ادب اسلامی کی حقیقت پر نظر رکھنے والوں کے لیے ادب کی یہ بے سمتی اور بے پرواہی اسی لیے ایک سوالیہ نشان بن کر سامنے آتی رہی کہ اگر انسان اور اُس کے معاشرے کے کچھ آداب ہیں، زندگی کی کوئی منزل ہے اور انسانیت کو اُس کی تخلیق کے وجوہ اور اسباب سے آشنا ہونے کی ضرورت ہے تو پھر اخلاق، مذہب، فکر، فن، ادب کے لیے بھی کسی ضابطے اور کسی مفید تر اور روح پرور جادۂ منزل کی ضرورت ہے یا نہیں؟۔

رابطہ ادبِ اسلامی کا قیام صرف ایک جدا ادبی شناخت کے لیے نہیں ہوا۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی برسوں کی فکر جو اُردو ادب کی معاصرانہ فکر اور مقصد کے نہایت گہرائی سے مطالعے اور تجزیہ وتجربے پر مبنی تھی، یہ تھی کہ:

’’یہ کسی ملک کے ادب وزبان کا سوال نہیں، دنیا کی بہت سی زبانوں اور ادب کے علمبرداروں کی شروع سے ایک کمزوری رہی ہے کہ جو ادیبوں کی وردی پہن کر اور دین واخلاقیات سے رشتہ توڑ کر اُن کی بزم میں نہیں آیا، اُس کو اُنہوں نے یا تو محفل میں آنے کی اجازت نہیں دی یا بادلِ ناخواستہ جگہ دی۔ ادب جس کو تقلید وروایت

پرستی سے سب سے زیادہ انکار اور لکیر کا فقیر بننے سے سب سے زیادہ عار ہونا چاہیے تھا اور جس کے خمیر و سرشت میں جدت و جرأت، ذہانت، ذوقِ جمال اور ادب کی زبان میں حسن پرستی شامل ہے اور جس کو بلبل کی طرح ہر گل کا شیدا اور ہر مظہرِ جمال و کمال کا شیفتہ و فریفتہ ہونا چاہیے وہ ادب اکثر موقعوں پر روایت پرست تعصب کا شکار اور رسم و رواج میں گرفتار نظر آتا ہے، ادب کی جو تعریف ہزاروں سال پہلے یونانی استاذوں نے طے کر دی، بہت کم ادیبوں اور نقادوں کو اُس سے سرتابی کرنے اور اس کے دائرے سے باہر قدم رکھنے کی جرأت ہوتی ہے''۔

حضرت مولانا کے ذہن میں اردو ادب کی تاریخ کے گہرے مطالعے سے یہ خیال بھی آیا کہ ادب کی آزمائش اور ابتلا یہ تو نہیں کہ اُس پر ایسے لوگ حاوی ہوجائیں جن کے افکار و نظریات میں استحکام کی جگہ تزلزل اور واضح تصور کی جگہ فکری انتشار اور تحریروں میں ابہام اور تشکیک کے عناصر کارفرما ہوتے جاتے ہوں۔

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے سامنے ایسے عظیم اہلِ قلم کا مکمل منظر نامہ تھا جنھوں نے اردو ادب میں بہترین تحریروں کا ایک چمن سجا دیا، لیکن ستم ظریفی یہ ہوئی کہ چونکہ یہ باکمال اہلِ قلم طبقۂ علماء میں شمار ہوتے تھے، صورتاً و سیرتاً متشرع تھے اور اپنی دُکانِ کمال پر ادبِ اردو کا سائن بورڈ بھی نہیں لگا رکھا تھا، اس لیے ادب کے نام پر ادبی سرمایہ داروں اور اجارہ داروں کی نظر میں وہ نہ تو صاحبِ نظر ہوئے، نہ ادیب، نہ صاحبِ اسلوب انشاء پرداز ٹھہرے۔

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے ایسے ہی فراموش کیے جانے والے ادیبوں کے متعلق لکھا کہ ایک فطری ادیب اور صاحبِ قلم کی پہچان یہ ہے کہ موضوع کیسا ہی سادہ، سنجیدہ اور خشک اور پُر تقدس ہو، وہ اپنے قلم کی جولانی، خیال کی رعنائی اور طرزِ ادا کی دلآویزی کو روک نہیں سکتا اور اُس کے لیے اپنے ادبی ذوق اور اسلوبِ تحریر سے عاری و خالی ہونا ناممکن ہوجاتا ہے۔

ادب کی روح کو پہچان لینے کی عادت و مہارت اپنے گرد و پیش میں ادب کے نام سے محض لفاظی اور سماج کی تصویر کشی کے نام سے عریانی و فحاشی اور فکر و نظر کے نام سے ادب میں خدا فراموشی اور فطرت کی نافرمانی پر مشتمل مادی فلسفوں کی ترویج کیسے برداشت کر سکتی ہے؟ اُردو ادب میں اِس قسم کے نظریات ہر بیس پچیس برس کے وقفے سے الگ الگ شناختوں، ناموں اور عنوانوں کی شکل میں آتے رہے، اُن کے فروغ میں ادب اور زبان و بیان کے معیار کی بلندی کم اور اشتہار کی نمائش زیادہ ہوتی گئی، اُردو ادب کا قاری دنیا کے اُن انسانوں کی طرح ہوگیا جو ہر جگہ نئے نئے مذہبوں اور نئے نئے فلسفوں کے آغاز و ارتقا اور تبدل و فنا کی نذر ہو کر مذاہبِ عالم کی تاریخ کا حصہ بن گیے۔ دیکھا جائے تو اُن مذاہب کے بننے بگڑنے کا عمل یوں ہی جاری رہتا اگر اسلام نے آکر فکر و نظر اور عقیدہ و عمل کی کاملیت اور اتمام نعمت کا ناقابلِ تردید اعلان نہ کر دیا ہوتا اور یہی وجہ رہی کہ ہر نظریہ اور ہر فلسفہ اسلام سے الرجی کی بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ ادبِ اسلامی کی اصطلاح سامنے آتے ہی قریب یہی حالت رونما ہوگئی۔ اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

ہاں رابطہ ادب اسلامی نے حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی رہنمائی اور مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ، مولانا سید واضح رشید ندویؒ اور ان کے رفقائے کار اور تربیت یافتہ ایک نسل کی مسلسل کاوشوں اور ادبِ اسلامی کے فروغ کے لیے پیہم کوششوں کے نتیجے میں اپنے مقاصد میں کامیابی کی راہیں تلاش کیں یا نہیں، یہ تو اردو زبان و ادب کے مستقبل کا مورخ ہی فیصلہ کرے گا لیکن ۱۹۸۶ء سے شروع ہونے والے اس کاروانِ ادب کے سفر پر صرف ایک نگاہ

ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پورا ملک ادب اسلامی کی صداؤں بلکہ اذانوں سے معمور ہوگیا۔

ہم یہاں عالمی رابطہ ادب اسلامی کی مساعی کو دہرانا نہیں چاہتے کہ یہ سب مختلف روداد وں میں پیش کی جا چکی ہیں، ریاض، استنبول اور قاہرہ، عمان، اردن، مدینہ منورہ وغیرہ شہروں میں ادبِ اسلامی کی آواز کس طرح بلند ہوئی، وہ ایک الگ تفصیل طلب مضمون ہے۔

ہندوستان میں ادب، تنقید، مغربی ادبی تحریکات، تحریکِ سید شہیدؒ کے اثرات، اردو زبان کی نعتیہ شاعری، تحریکِ آزادی، حمد ومناجات و دعا، مکتوباتی ادب، تاثراتی ادب، حدیثی ادب، ادبی سفر نامے، سوانحی ادب، ملفوظات ومواعظ کی ادبی اہمیت، تاریخ نگاری کا ادبی جائزہ، قصیدہ نگاری، ادبِ اطفال، اسلامی ادب کی نمائندہ خصوصیات، اردو شاعری اور ملی احساسات کی ترجمانی، تراجم قرآنی کا ادبی جائزہ، ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اردو زبان و ادب کی تشکیل، اردو زبان وادب کا ارتقا اور علماء کا حصہ، اردو ادب وشاعری پر عربی زبان کے اثرات، قرآنِ مجید کا اعجازِ بیان، کتبِ سیرت کا جائزہ، اسلامی ادب اور ذرائعِ ابلاغ کی اہمیت، ادبِ نبوی کا تربیتی پہلو، علامہ شبلیؒ اور مولانا علی میاں ندویؒ کی تحریروں کا ادبی جائزہ، انسانیت کی خدمت میں مختلف اصنافِ ادب کا حصہ، اردو زبان و ادب کے ارتقا میں دکن کا حصہ وغیرہ عنوانوں اور موضوعات سے ادبِ اسلامی کی ملک گیری ہی نہیں جہاں گیری کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ اِن موضوعات میں اصنافِ ادب اور شخصیاتِ ادب دونوں کے تذکرہ وتعارف کے علاوہ اردو زبان کی اشاعت، اُس کے لیے اداروں کی فراہمی اور اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے لیے قوم کے حساس اور دردمند افراد اور جماعتوں، تحریکوں اور تنظیموں کو موضوع بنائے جانے کی خواہشوں اور ارادوں کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

ادب کے موضوع پر یقیناً فنی اور علمی مباحث میں ادب و شعر سے ربط کی نوعیت دیکھی جاتی ہے، لیکن اِن فنی مباحث میں اُن دلوں اور دماغوں کے سوز و درد و داغ کو کیسے جدا کیا جا سکتا ہے جو اصطلاحی معنوں میں ادیب وشاعر نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے قول و عمل سے زندگی بھر اُن جہانوں کی تلاش وتخلیق میں سرگرداں رہے، جہاں لکھنے والوں اور پڑھنے والوں، سمجھنے والوں اور سمجھانے والوں کی کمی نہ ہو۔ کتاب اور قاری کے رشتوں پر مبنی خاندانوں کی ضرورت کبھی کم نہیں ہوئی، اِس ضرورت کو پورا کرنے والوں کی اپنی دنیا ہوتی ہے، ادب اسی دنیا سے قوت اور توانائی حاصل کرتا ہے۔

ایسے ہی علم وادب کے خاموش لیکن بنیادی خدمت گزاروں میں ایک شخصیت حضرت مولانا شاہ محمد عبدالرحیم صاحب مجددی نقشبندیؒ کی ہے، خواجہ چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح شاہ صاحب کے جدامجد شاہ ہدایت علیؒ نے اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر راجستھان کی زمین سے رشتہ جوڑ لیا۔ اب جن کی نسبت میں مجددی رنگ شامل ہو جائے تو پھر حضرت مجددالفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی برکتوں کے ظہور سے انکار کی مجال کس کو ہوسکتی ہے؟۔

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۲۰ء میں جے پور میں پیدا ہوئے اور ۱۹۹۴ء میں انہوں نے وفات پائی۔ اُن کا سب سے شاندار اور عظیم کارنامہ اہلِ نظر کی نظر میں جے پور میں جامعۃ الہدایہ کا قیام ہے۔ تین طرف سے خشک پہاڑوں کے دامن میں سرسبز وادی کا تصور ہی حسنِ ذوق کی سب سے نمایاں علامت ہے۔ اِس کو دیکھ کر رابطہ ادبِ اسلامی کے بانی حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو حجاز کی پہاڑیوں اور وادیوں کی یادیں تازہ ہوگئی تھیں۔ یہ جامعہ، مولانا ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ذہن ومزاج کے

حوالے سے نشانِ قیس وشانِ کوہ کن بن گیا۔ مولانا مجددی رحمۃ اللہ علیہ کی صفات میں ایک صفت علمی ذوق کا ذکر مولانا ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے کئی بار کیا، حضرت مجددی نے سب سے پہلے اِسی جامعہ کے دامن میں رابطہ ادبِ اسلامی کے کارواں کی ضیافت کرتے ہوئے جو خطبۂ استقبالیہ دیا مولانا ندوی نے اس کے ادب کی قوت اور اثر آفرینی کی داد دی۔

حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد رابطہ ادب اسلامی کی ذمہ داری ہمارے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے سنبھالی۔ ہمارے مولانا کی زندگی کا یہ باب کسی طرح کم اہمیت کا حامل نہیں کہ انہوں نے ادبِ اسلامی کے فروغ کو گویا سب سے زیادہ ترجیح دی، جن خوش نصیبوں کو ہمارے مولانا کی قربت کا شرف حاصل ہوا، وہ گواہی دیں گے کہ ہمارے مولانا کی ہر گفتگو میں رابطہ ادبِ اسلامی کی ترقی کی فکر شامل رہتی تھی، وہ بھی مولانا عبدالرحیم مجددی رحمۃ اللہ علیہ کے جذبۂ اصلاح وتربیت کے ثنا خواں تھے کہ مولانا مجددی کا جامعۃ الہدایہ صحرا میں بہار کی طرح ہے، اِس بہار کا مطلب اِس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ قرآن و حدیث جیسی ادبِ عالیہ کی سب سے ارفع و اعلیٰ مثالوں سے ہر زمانے کے ادب کو مقصدیت، پاکیزگی اور دائمی افادیت عطا کرنے والوں کی کارگاہ یعنی مدرسے کی راہیں ہموار کی جائیں ۔جامعۃ الہدایہ نے اپنے رسالے ''الہدایہ'' کے ذریعے فروغِ ادب کی جو کوششیں کیں اُن کا اعتراف ایک حق ہے جس کو ادا ہی کیا جانا چاہیے

مولانا محمد سالم قاسمی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا مجددی کے متعلق کیا خوب لکھا کہ ہر زمانے کی طرح عصرِ حاضر کے الحاد و بے دینی کی شبِ تاریک میں عروج وہدایت کی قندیلِ ربانی ضرور روشن رہے گی اور اُس کو اپنی آتشِ عشق سے روشن رکھنے والے مولانا مجددیؒ کے لیے قبولیت کی علامت ہوجائے گی۔

مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ مولانا مجددی کے نفسِ گرم سے ہزاروں کے دلوں میں اجالا تھا، علم و عرفان کے اس گوہرِ شب چراغ سے ایک پورا علاقہ جگمگا رہا تھا۔ اُنہوں نے مولانا مجددی کے بارے میں لکھا کہ علم وفن اور ادب سے اُن کو خاص لگاؤ تھا۔

یہ صحیح ہے کہ مولانا مجددی نے عرفِ عام میں ادبی یادگار نہیں چھوڑی، مگر مولانا محمد ولی رحمانی نے نہ جانے کس کیفیت میں یہ جملہ اپنے قلم کے ذریعے ادب نوازوں کے لیے بطورِ تحفہ پیش کر دیا کہ ہمارے حضرت شاہ صاحب علماء میں شاہ جہاں ہیں۔شاہ جہاں نے بھی ادب میں اپنی کوئی بڑی اور منفرد یادگار نہیں چھوڑی لیکن تاج محل کی شکل میں جمالیاتی ادب کے لیے وہ خوبصورت ترین تالیف مرتب کردی جس کی روشنی میں شاہ جہاں کو ادب شناس ثابت کرنے میں کسی اور مرجع ومصدر کی ضرورت نہیں رہتی۔ رابطہ ادبِ اسلامی کا فرض تھا کہ ہندوستان میں ادبِ اسلامی کی بنیاد پڑنے سے اُس کے ذی المعارج ہونے تک کی منزلوں میں جن ادب شناس، ادب نواز اور ادب ساز شخصیتوں کی کاوشیں شامل رہیں، اُن کی زندگی کی جھلکیوں کو جمع کرنے اور اُن کو پیش کرنے کی محفل آراستہ کرے۔

اِس موقع پر رابطہ ادبِ اسلامی کے صدر ہمارے مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور رابطے کے نہایت فعال سیکرٹری مولانا محمد واضح رشید ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی یادیں اور باتیں قدرتاً دل ودماغ کی دنیا پر سایہ فگن ہیں۔ساتھ ہی مولانا نذر الحفیظ ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا شفیق چہرہ بھی سامنے ہے، اِن حضرات کی محنتوں اور محبتوں اور دعاؤں نے رابطہ ادبِ اسلامی کی افادیت اور نافعیت کو کبھی کم نہ ہونے دیا۔ ایک تحریک کی شکل میں ادبِ اسلامی کے پیغام کو ادب

کی زبان میں پیش کرنے کی جو مہم ندوۃ العلماء کے ایک نہایت اہم اور بنیادی مقصد کی ترویج کے لیے شروع ہوئی، وہ زندہ ہے اور انشاء اللہ زندہ رہے گی۔ علامہ شبلی، مولانا عبدالحئی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا عبداللہ عباس ندوی، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی، یہ تو اردو ادب کے آسمان پر روشن ہونے والے چند ستارے ہیں، اِن کے جلو میں ندوہ و دارالمصنّفین ہی کیا پوری اردو دنیا، ادبِ اسلامی کی نمائندگی کرنے والوں کی تحریروں اور ادب عالیہ کے اِن کے شاہکاروں سے مزین ہے۔

جامعۃ الہدایہ میں اِس سیمینار کے ذریعے ایک بار پھر نئی نسل کو اردو ادب کی وسیع تر دنیا میں اپنے وجود کو ثابت کرنے کی آرزو زندہ ہو جائے اور ادب کے تمام اصناف میں اِس کے ذریعے فن پاروں کو شہ پاروں کی صورت بدل دینے اور جدید اردو ادب کو پُر ثروت بنانے کی تمنا بیدار ہو جائے تو رابطے کو کہنے کا حق حاصل ہوگا کہ

شادم از کوششِ خویش کہ کارے کردم

اِس موقع پر جو بات سب سے پہلے کہنے کی تھی اُس کو خیر الختام یا مسک الختام کی تعبیر سمجھتے ہوئے آخر میں کہنا بے ادبی نہیں کہ مولانا شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات اور اُن کے ذریعے راجستھان میں اسلامی ادب کی روایات کو تازہ کرنے کی یہ فرصت ہم سب کو مولانا فضل الرحیم مجددی زادفضلہ کی توجہ بلکہ توجہاتِ مجددیہ سے ملی۔

مولانا فضل الرحیم صاحب مجددی نے مجددشرف اور علم و ادب کی مقدس و مطہر خاندانی روایت کی پاسداری میں خود کو ایک مثال کے طور پر ڈھالا ہے، اِس کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے، وراثت غیر معمولی صلاحیت کے ساتھ دشتِ جنوں کی دیوانگی کی نعمت کا تقاضا کرتی ہے۔ مولانا فضل الرحیم نے کم عمری ہی میں کوہکن کی خارا تراشی کے فن کو اپنا کر خود کو اپنے مذہب، اپنی قوم، اپنے شہر اور اپنے ملک کے لیے ایک نئے فرہاد کی صورت میں پیش کر دیا ہے۔

رابطہ ادبِ اسلامی کے جے پور کے پہلے سیمینار کے بعد نئے حالات اور نئی ضروریات اور زبان و ادب کے نئے نئے تقاضے سامنے آئے۔ یقین ہے کہ ایثار و اخلاص کے زادِ سفر سے شروع ہونے والے اِس کارواں کا یہ نیا سفر بھی کامیابی اور کامرانی کی منزلوں سے ہمکنار ہو کر رہے گا۔

تمنا یہی ہے کہ اردو زبان و ادب کا وہ اِسلامی دور شروع ہو جو ابلیسی اور دجالی مصنوعی ذہانتوں کی ظاہری چمک دمک کے ماروں کے لیے یدِ بیضا کی خیرہ کن روشنی بن جائے۔ اِس سفر کا آغاز اللہ کے ایک نہایت نیک بندے کی یادوں سے شروع ہونا سفر کی آسانیوں کے لیے فالِ نیک کے سوا اور کیا ہے؟ اب اس قافلے کے حدی خوانوں میں مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی اور مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی پیش پیش ہیں جن کے پاس دعوت و عزیمت کا بڑا ورثہ ہے جس میں جذبوں کی کمی ہے نہ حوصلوں کی۔ اِس لیے سرخروئی کی امید کی جانی چاہیے۔

آخر میں جامعۃ الہدایہ اور اِس کے تمام وابستگان اور جے پور کے ادب نواز بلکہ ادب کی ریاست کے مہاراجوں اور نوابوں کی خدمت میں رابطے کی جانب سے نذرانۂ سپاس و تشکر پیش ہے اور دعا ہے کہ جس طرح راجستھان کے خوبصورت شہروں اور یہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے ماضی میں اردو زبان سے اپنی محبت اور زبان و ادب کی اعلی قدروں کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا، رابطے کے اِس مجلس مذاکرہ کی برکت سے خدا اِس سلسلے کو اور دراز اور دراز تر کرے۔ آمین۔

❁❁❁

ادب اطفال کے چند باکمال معمار

تصنیفات اور امتیازی خصوصیات

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی

ادب اطفال-ایک مستقل فن

پورے عالم میں بچوں کی بنیادی اور معلوماتی تعلیم وتربیت کے لئے اہل علم وادب کی خاص توجہ،ادبی تاریخ کا ایک اہم صفحہ قرار دیا گیا ہے، ہر ملک وقوم میں بچوں کوادب سکھانے کی کوششیں ہوتی رہیں،شہری ماحول ہو، یا دیہاتی سماج، ہر جگہ اپنے اپنے ذوق اور سطح کے مطابق بچوں کو معاشرہ کے زندہ وتابندہ افراد کی شکل میں پیش کرنے کی کوششیں جاری ہیں، ہمارے ملک میں اور خاص طور سے مسلم سماج میں اس بنیادی حقیقت کی طرف خاص طور سے توجہ مبذول ہوئی ہے۔

اگر چہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ماں کی گود بچے کا بنیادی مدرسہ ہے اور وہ اپنے مستقبل کو تعمیر کرنے کیلئے اسی بنیاد کی طرف رجوع کرتا ہے،لیکن اس تعمیر کے وسائل وذرائع فکر بھی ایک لازمی عنصر ہے،اوراس کے بغیر تعمیر کا کام شروع ہونا ناممکن ہے، یہی وجہ ہے کہ بچوں کیلئے انہیں کی زبان میں ایسا لٹریچر اور ادب تیار کیا جاتا ہے جو تعمیری صلاحیتوں سے بھر پور ہوتا ہے۔اور زندگی کو صحیح تعمیری رخ پر لے جانے کے لئے اسمیں ہر طرح تعمیری عنصر بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے،اور بچے کی عمر جوں جوں بڑھتی جاتی ہے وہ زبان وادب سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔

بچوں کے ادب میں مولانا اسماعیل میرٹھی کا مقام

بچوں کے ادب کے سلسلہ میں مولانا اسماعیل میرٹھی کا نام ہر اعتبار سے قابل اعتناء اوراہل ادب کی توجہات کومبذول کرانے میں سرفہرست ہوسکتا ہے،انہوں نے بھی بچوں کے ذہن کواللہ تعالی کی قدرت اوراسکی عظمت کی طرف مبذول کرانے میں اپنی ادبی حکمت کو بھر پور استعمال کیا ہے، ماضی قریب میں ان کی کتابیں ابتدائی درجات میں داخل کر کے بچوں کوزبان سکھانے کے لئے ایک بہتر نصاب متصور ہوتا ہے،جس میں زبان کی حلاوت کے ساتھ دین کے ادراک وشعور کا پورا لحاظ رکھا گیا تھا،انہوں نے نظم ونثر کے دونوں اسلوب کواس مقصد کے لئے اپنی کتابوں میں استعمال کیا ہے،جس کو نہایت آسانی کے ساتھ بچوں کا ذہن قبول کر لیتا ہے،ابتدائی مکتب میں پڑھنے والے بچوں کی زبان پر یہ شعراکثر جاری رہتا تھا اور وہ بہت ہی شوق کے ساتھ مدرسوں، گھروں اور گلی کوچوں میں پڑھتے ہوئے سنائی دیتے تھے ؎

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

بچوں کے ادب میں ان کی نفسیات کا اوران کے درجہ عقل

وفہم کا لحاظ کرنا ضروری ہوتا ہے، اس کے لئے قصے کی زبان ان کے ذہن کو سب سے زیادہ اپیل کرتی ہے۔

مفکر اسلامؒ اور بچوں کا ادب

ماضی قریب میں ادباء کی ایک جماعت بچوں کی نفسیات کے مطابق بچوں کا ادب تیار کرنے میں اچھی شہرت کے درجہ پر پہونچی، اورانہوں نے حکایات انبیاء کے ذریعہ سے ان کے ذہنوں کو مخاطب کیا، اور اس میں وہ درجہ کمال تک پہونچے، اور نہ صرف بچوں کے ماحول میں ان کا یہ ادب بہت مقبول ہوا، بلکہ ہر طبقہ میں اسکا استقبال ہوا، اور بہت سے ادیبوں نے اسی اسلوب کی بنیاد پر بچوں کا حکایتی ادب تیار کیا، اگر چہ اس میدان میں اور بہت سے لوگ قابل ذکر ہیں، لیکن بچوں کے ادب کے قاعدہ اول کے طور پر گذشتہ صدی میں علامہ کبیر داعی اسلام، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے بچوں کے اسلامی ادب کو انہیں کی زبان واسلوب میں، اورانہیں کی نفسیات کے مطابق انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کے قصوں سے اسکی ابتداء کی، اگر چہ یہ ادب عربی زبان میں شروع ہوا ، اور اسکو دین کے ساتھ عربی زبان سیکھانے کے لئے استعمال کیا گیا ، اور قصص النبیین کے نام سے یہ سلسلہ بچوں کی نفسیات اور ان کے ذہن کے مطابق پہلے حصے سے شروع ہو کر پانچویں حصے پر منتہی ہوا، اس میں نہایت آسان زبان اور ایک ہی لفظ کو ایک جملے میں کئی بار استعمال کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ، بلکہ بچوں کے ذہن میں حضرت ابراہیمؑ کے قصے میں عقیدہ توحید کو اتارنے اور اسکو راسخ کرنے اور شرک و بت پرستی کی نفرت ان کے ذہنوں میں جمانے کی نہایت کامیاب کوشش ہے۔

قصص الانبیاء مرتبہ جناب امۃ اللہ تسنیم صاحبہؒ بچوں کے ادب کا شاہکار

یہی وجہ ہے کہ یہ سلسلہ نہ صرف ہندوستان جیسے ملک میں مقبول ومحبوب ہے، بلکہ ان ممالک میں بھی اس کو اختیار کیا گیا، جہاں کی عوامی اور سرکاری زبان عربی ہے، قصص النبیین کے اس سلسلہ سے یہ بات بھی پوری طرح ذہن نشیں کرائی گئی کہ ہمارے مذہب اسلام کی سرکاری زبان عربی ہے، اسی سلسلہ کے مطابق اردو زبان میں بھی حسنی خاندان کی ایک معزز ہستی امۃ اللہ تسنیم صاحبہ نے اردو زبان میں تیار کیا، اور انبیاء کے تعارف کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کی قادر مطلق ہستی کا تصور بچوں کے ذہن میں پوری طرح اتارنے کی کامیاب کوشش ہوئی۔

بچوں کے ادیب حکیم شرافت حسین رحیم آبادیؒ

اور انہیں سلسلوں کے درمیان میں بچوں کے ایک ماہر نفسیات، صاحب زبان وادب جناب حکیم شرافت حسین رحیم آبادی نے دین ودانش کی تعلیم وتربیت بچوں کے ذہن کے مطابق کرنے کے لئے اچھی باتوں کا سلسلہ شروع کیا، جس میں آسان اور دلچسپ اور سلیس زبان میں کلمۂ توحید کو بچوں کے دلوں میں راسخ کرنے کی کوشش کی ، اس حصے کے چند عناوین کو پڑھنے سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ انہوں نے نہایت ہی آسان زبان میں عقیدہ توحید کو بچوں کے رگ وریشے میں سمو دینے کی پوری کوشش کی ہے، آیئے عنوانات پر ایک نظر ڈالتے ہیں:

پہلا عنوان ہے: سب کو کس نے بنایا؟

اس عنوان کے ماتحت بچوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے:

’’یہ زمین، جس پر ہم تم رہتے ، بستے ، کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے ہیں، کتنی بڑی زمین، کتنی لمبی اور چوڑی زمین، کس

نے بنائی، کتنے آدمی اس زمین پر بستے ہیں، کتنے جانور اس زمین پر چلتے اور پھرتے ہیں، یہ طرح طرح کے آدمی اور یہ طرح طرح کے جانور، نہ آدمیوں کی کوئی حد، نہ جانوروں کا کوئی شمار، کس نے پیدا کئے،؟ یہ اونچے اونچے پہاڑ، پہاڑوں سے نکلنے والے دریا، کتنے بڑے بڑے دریا، کتنے بڑے بڑے سمندر، سمندر میں بھی طرح طرح کے جانور اور بے جان چیزیں کس نے پیدا کیں؟

یہ آسمان، جس کے نیچے تمہاری اتنی بڑی دنیا بستی ہے، یہ گرم گرم سورج، جس کی کرنیں ساری دنیا کو روشن کرتی ہیں، یہ رات کی اندھیری میں چاندنی پھیلانے والا، آنکھوں میں ٹھنڈک پیدا کرنے والا چاند، چاند کے گرد چمکنے والے یہ چھوٹے چھوٹے تارے کس نے بنائے؟

اچھا، دیکھو تو، آسمان کی طرف آنکھیں اٹھاؤ، زمین کے اوپر نظر دوڑاؤ، دماغ سے سوچو، دل میں خیال کرو، آنکھوں سے جو چیزیں دیکھتے ہو، کانوں سے جن چیزوں کے نام سنتے ہو، دماغ جن چیزوں کو سوچ سکتا ہے، دل میں جن چیزوں کا خیال آسکتا ہے، ان سب چیزوں کو کس نے بنایا؟ تمہارے گھر کو معمار نے بنایا ہے، تمہاری کرسی اور میز کو بڑھئی نے بنایا ہے، لیکن معمار کو کس نے بنایا؟ معمار نے جس مٹی سے گھر بنایا، وہ مٹی کس نے بنائی، بڑھئی کو کس نے بنایا،؟ بڑھئی نے جس لکڑی سے میز اور کرسی بنائی وہ لکڑی کس نے بنائی،؟ وہ کون ہے، جس نے سب کو بنایا اور اس کو کسی نے نہیں بنایا، تم کہو گے،: اللہ''۔

اسی عقیدۂ توحید کا تکملہ اس کتاب کے دوسرے حصے میں موجود ہے، اس عقیدہ کو پھیلانے میں انبیاء کرام نے جو محنتیں کیں، اور اخیر میں خاتم النبیین حضرت محمد ؐ نے جن حالات کا سامنا فرمایا اور آپ ؐ نے اور آپ کے اصحاب نے اسکو پھیلانے کے لئے جن تکلیفوں اور مصائب کو برداشت کیا اس کا ذکر اس حصہ میں بچوں کی زبان میں کیا گیا ہے، انبیاء میں حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور اخیر میں ہمارے رسول پاک حضرت محمد مصطفی ؐ کا ذکر ہے، اس عقیدہ کو پھیلانے اور اس کا یقین دلوں میں پیدا کرنے کیلئے جو مصیبتیں اٹھائیں ان کا ذکر آسان اور سلیس زبان میں موجود ہے۔

حضرت مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ کی تائید:

اس حصہ کے مقدمہ میں مولانا عبد السلام قدوائی ندوی ؒ سابق معتمد تعلیم ندوۃ العلماء نے لکھا ہے:

> ''دعوت اسلام کی راہ میں جو مشکلات پیش آئیں اور داعیان اسلام نے ان مشکلات کو جس خندہ پیشانی سے برداشت کیا، یہ واقعات داعیان حق کے لئے ہمیشہ ہمت افزائی کا باعث رہیں گے، سیرت کی بڑی کتابوں میں بڑی تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں، محب کرم، حکیم شرافت حسین صاحب نے بالکل چھوٹے بچوں اور بالغ مبتدیوں کے لئے بہت ہی آسان زبان میں ان واقعات کا خلاصہ بیان کر دیا ہے، تاکہ تعلیم و تربیت کی ابتدائی منزل ہی میں یہ واقعات دلوں میں اس طرح جم جائیں کہ پھر زندگی کے آئندہ دور میں جو مشکلات و مصائب پیش آئیں، ان کے مقابلے کی ہمت ہو، اور حالات کی سخت ناموافقت میں بھی اسلام کے پھیلانے کا حوصلہ ہو''۔

اس رسالہ کے تیسرے حصہ کو ایک اہم سوال سے شروع کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ پوری زندگی کو عبادت والی زندگی کیسے بنائی جائے؟

اس سوال کا جواب نہایت تفصیل کے ساتھ بچوں کی آسان زبان میں دیا گیا ہے، اس سلسلہ کا پہلا عنوان ہے:

''اللہ کی عبادت کیا ہے؟ عبادت والی زندگی کیسے بنے، پھر نماز قائم کرنے کا اور اس کو اللہ کی اہم ترین عبادت کا درجہ دینے کا ذکر ہے، چوتھے حصے کی ابتدا اس عنوان سے ہوتی ہے: نماز کے لئے تیاری، وضو کرنے کا طریقہ، وضو کے فرائض، اسکی سنتیں، اس کے مستحبات، نواقض وضو، تیمم، نماز پڑھنے کی شرطیں، اسکے اوقات کا بیان، فرض نماز جماعت کے ساتھ ادا کی جائے، اس کا طریقہ، اس کی اہمیت، نماز شروع کرنے کی ترکیب، اور نماز ادا کرنے کا پورا طریقہ نقش ذہن بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے، اس رسالہ کے پانچویں حصہ میں نیکی کرنے، اسکی اہمیت، اور زندگی کے فضائل کو خاص انداز میں ذکر کیا گیا ہے، اور یہ بتایا گیا ہے کہ دوسروں کے ساتھ نیکی کرنا بھی اللہ کی عبادت ہے، چھٹے حصہ میں روزہ کی اہمیت اور اسکے فضائل وآداب کو خاص اسلوب میں بیان کیا گیا ہے، روزہ کے سلسلہ میں جو احادیث ذکر کی گئی ہیں، اسکو نہایت آسان زبان میں پیش کیا گیا ہے، ایک حدیث میں ہے: جب تم میں سے کسی کے روزہ کا دن ہو، تو اس کو چاہئے کہ وہ فحش نہ بولے، اور شور نہ کرے اور اگر کوئی اس کو گالی دے تو اس سے کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں، جو شخص جھوٹ بولنا اور فحش بولنا نہ چھوڑے تو اسکو کھانا پینا چھوڑنے کی حاجت نہیں ہے، اسکی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اگر روزہ کے ظاہری شرائط کے ساتھ ساتھ روزہ کے باطنی شرائط بھی ادا ہونے لگے تو تم متقی ہو جاؤ، اسکے بعد تقوی کیا ہے اور روزہ کے فوائد کیا ہیں، روزہ کس طرح رکھا جائے، ان تمام باتوں پر رسالہ کا یہ حصہ مشتمل ہے۔''

حکیم شرافت حسین رحیم آبادی نے ''ہمارا ایمان'' کے نام سے جو رسالہ تحریر کیا ہے اس میں بچوں کو نہایت آسان اور سلیس زبان میں ایمان کی حقیقت بتائی ہے اور اس کی تشریح کی ہے، اس رسالہ کے چند عناوین پیش کئے جارہے ہیں: اللہ ہی نے سب کو سب کچھ دیا ہے وہ ہماری تعریفوں سے بلند وبالا ہے، لا الا الا اللہ، ہمارے پیارے نبی ا ساری دنیا کیلئے رحمت بن کر آئے، قرآن سب سے اچھی کتاب، شرک کیا ہے؟ مشرک کون ہے؟ ایک دن سب کو یہاں سے جانا ہے، قیامت اور آخرت کا دن۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی رائے عالی:

اس کتاب پر حضرت مولانا علامہ سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا پیش لفظ ہے، اس مقدمہ کا ایک اقتباس پیش کرنے کی اجازت دی جائے:

''راقم سطور کو تقریباً ۱۹۳۰ء سے مولوی حکیم شرافت حسین صاحب سے نیاز حاصل ہے، میں بھی اس وقت طالب علم تھا اور وہ بھی ہمارے استاذ ڈاکٹر شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی سابق استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء وحال استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ کے پاس عربی پڑھنے آئے تھے، ہلالی صاحب ہی نے میرا ان سے تعارف کرایا، یہ ملاقات رفتہ

رفتہ رفاقت وعلمی تعاون میں تبدیل ہوگئی ،انہوں نے اس زمانہ میں ایک کتاب ''گردش ایام'' کے نام سے لکھی تھی ،مجھے اس پر مقدمہ لکھنے کی عزت حاصل ہوئی ،یہ کام ایسی نیک ساعت میں ہوا تھا، کہ کتابوں پر مقدمہ باز ہوگیا،وہ شاید اسی طرح کتابیں لکھنے کا سلسلہ جاری رکھتے ،اور ہندوستان کے ان مصنفین کے زمرے میں شہرت حاصل کر لیتے ،جن سے تصنیفی کوششوں کا میدان بالغین اور پڑھے لکھوں تک محدود ہے،شاید ان کے ذہن اوران کے اشہب قلم کو بچوں کے میدان کی طرف موڑنے میں میرا بھی حصہ ہو،انہوں نے جلد اس کو اپنا مستقل میدان بنایا،اور اللہ کے رسول ،حضرت ابوبکر ،حضرت عمر،حضرت عثمان، حضرت علی اوراچھی باتیں (۱ تا ۶) کے نام سے متعدد کتابیں لکھیں ،اور بچوں کا قاعدہ بھی لکھا ،یہ سب کتابیں ہندوستان اور پاکستان میں بڑی مقبول ہوئیں ،اور بہت سے مکتبوں اور مدرسوں کے نصاب میں داخل ہوگئیں ،اور ان کا مکتبہ صحیح معنوں میں ''مکتبہ دین ودانش'' بن گیا،ان کو اس میدان میں اتنی کامیابی وشہرت حاصل ہوئی اور انہوں نے مسلمان بچوں کی ایسی خدمت انجام دی کہ اب ان کو ''مسلمان بچوں کے شرافت'' کے نام سے یا ''مسلمان بچوں کے مصنف'' کے لقب سے بھی یاد کیا جا سکتا ہے اور یہ ایک بڑا تمغۂ امتیاز ہے جس پر ان کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ بڑوں اور پڑھے لکھے لوگوں کے لئے تو کام کرنے والے بہت تھے، خدا نے ان سے نونہالوں کی خدمت لی ،جن پر مستقبل کا انحصار اور صحیح معنوں میں اس ملک میں اسلامیات کے بقا کا دارومدار ہے۔

یہ رتبۂ بلند ملا، جس کو مل گیا

اس وقت ان کی کتاب ''ہمارا ایمان'' پیش نظر ہے،اس میں انہوں نے بڑے سلیقے سے ایمانی بنیادیں اورامہات عقائد(توحید، رسالت ،آخرت اور تقدیر) کو بڑے آسان اور سلجھے انداز میں بچوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے،اوران کو ہجے کر کے ایک ایک چیز بتائی ہے اورانہیں کی زبان میں ان سے ایمانی باتیں کی ہیں، ہر سبق کے بعد سوالات بھی ہیں، جو مضامین کو ذہن نشیں کرنے کا ایک آزمودہ طریقہ ہے،اگر دلچسپی وہمدرری اور داعیانہ اسپرٹ اورایک معلم کے ذوق کے ساتھ یہ کتاب پڑھائی جائے،تو امید ہے کہ اس سے نہ صرف بچے ان بنیادی عقائد سے آشنا ہوں گے،جس کے بغیر کوئی مسلمان مسلمان نہیں ہوسکتا، بلکہ ان کی وقعت اور اپنے سن وسال کے مطابق ان کی معقولیت بھی ذہن نشیں ہوگی ،اور یہ تخم برگ وبار لائے بغیر نہ رہ سکے گا''۔

حکیم صاحب نے اپنے رسالہ ''اللہ کے رسول ﷺ'' میں حضور پاک ؐ کی سیرت بچوں کی زبان اور اسلوب میں بیان کر کے ان کے دلوں کو اللہ اوراسکے رسول ؐ کی محبت سے معمور کر دیا ہے،اس رسالہ میں سب سے پہلے عقیدۂ توحید،انبیاء کرام،اور اللہ کی بھیجی ہوئی آسمانی کتابوں کا ذکر ہے،قرآن کریم کی عظمت ان کے دلوں میں راسخ کرنے کی کوشش، جنت ودوزخ کا ذکر،رسول اکرم ؐ کے حالات زندگی شروع سے لیکر اخیر تک لکھنے کے بعد بچوں سے سوال کیا ہے:

اس پوری کتاب کو پڑھنے کے بعد بتاؤ تم کیا بنو گے اور کیا کرو گے؟

اس رسالہ میں ہر سبق کے بعد سوالات دیئے گئے ہیں، تا کہ بچے ان کے سوالات کا جوابات دیکر حضور اکرم ا کی عظیم شخصیت اور ان کے رحمۃ للعالمین ہونے کا یقین اپنے دلوں میں پوری طرح جما سکیں۔

یہ رسالہ بھی مولانا عبد السلام قدوائی ندوی کے قیمتی مقدمہ سے مزین ہے۔

مولانا سراج الدین ندوی اور ان کا ادب اطفال میں حصہ

مولانا سراج الدین ندوی ملک کے ایک معتبر عالم، صاحب اسلوب انشا پرداز اور نسل نو کے بہترین معمار ہیں، اللہ تعالی نے ان کو دار العلوم ندوۃ العلماء میں علوم اسلامیہ کی تحصیل کا موقع فراہم کیا، یہاں کے قیام کو انہوں نے غنیمت جانا، اور ایک مثالی عالم اور داعی بن کر قوم وملت کی خدمت کر رہے ہیں، ان کے تعلیمی ادارے ہیں، جوملت اکیڈمی کے زیر انتظام سرگرم ہیں اور ایک رسالہ ماہنامہ ''اچھا ساتھی'' ہے، وہ ضلع بجنور سے مولانا سراج الدین ندوی کی ادارت، اور محمد یسین ذکی، مولانا ذوالفقار ندوی، طلحہ سراج، محمد دانش، وسیم فلاحی کی معاونت میں شائع ہو رہا ہے، اس کے ذریعہ اسلامی فکر اور دینی معلومات کی اشاعت مثبت انداز میں ہو رہی ہے، ''اچھا ساتھی'' بچوں کا صرف ایک رسالہ ہی نہیں، بلکہ تعمیری فکر کا نمائندہ ادارہ ہے، اس کے کالمز میں اداریہ، مناجات، قرآنی سبق، نعت، ہنسو ہنساؤ، قصے، بلاعنوان کہانی، ماہانہ مقابلہ، آیا خط وغیرہ موضوعات ہیں ۔بچوں کی نفسیات کے مطابق مواد فراہم کرنا، اور ان کو سلیقہ سے پیش اعلی درجہ کی ذہانت اور استعداد چاہتا ہے، اس راہ کے مسافروں کو اس کی نزاکت کا احساس بھی ہوتا ہے، اور وہ اس کا فائدہ بھی محسوس کرتے ہیں۔

مولانا سراج الدین ندوی ان باتوفیق افراد میں ہیں جو بچوں کے اسلوب میں ان کی سطح کے مطابق دینی، تربیتی غذا فراہم کرتے رہتے ہیں۔ذیل میں ان کی تحریر کا ایک نمونہ پیش خدمت ہے، وہ قرآن سبق کے نام سے سورۂ کوثر کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" بسم الله الرحمن الرحيم ، انا أعطيناك الكوثر ، فصل لربك وانحر ، ان شانئك هو الأبتر (سورۂ الکوثر: ۱۔۳) ۔اے نبی! بے شک ہم نے آپ کو بہت زیادہ بھلائی عطا کی ہے، پس آپ اپنے رب کے لئے نماز پڑھئے اور قربانی کیجئے، بے شک آپ کا دشمن بے نسل ہو کر رہے گا۔

یہ مختصر سی سورت ہم اکثر وبیشتر نماز میں پڑھتے ہیں، مکہ کے مشرکین جب پیارے نبی اور آپ کے اصحاب کو ستار ہے تھے اور طرح طرح کی ایذائیں دے رہے تھے اس وقت یہ سورت نازل ہوئی، اس میں پیارے نبی ﷺ کو ڈھارس بندھائی گئی ہے، اور یہ خوش خبری سنائی گئی کہ اللہ تعالی آپ کو کوثر (بہت زیادہ بھلائی) عطا کرنے والا ہے، اور آپ کا دشمن برباد ہونے والا ہے، آپ اس شکرانہ میں نماز پڑھتے رہئے، اور اللہ کی راہ میں قربانی پیش کرتے رہئے۔

نماز کے ذریعہ آدمی اللہ کی خوشنودی کے لئے اپنا جسم اور وقت لگاتا ہے، اور قربانی کے ذریعہ اپنا مال خرچ کرتا ہے، جسمانی اور مالی قربانیاں انسان کے سچا مؤمن ہونے کا

ثبوت ہیں۔

اس سورت میں جو بشارت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائی گئی ہے، وہ بشارت پوری ملت کو سنانا مقصود ہے، اللہ نے آج بھی ملت اسلامیہ کو بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے، ایمان کی دولت سے سرفراز کیا ہے، ان تمام نعمتوں کا تقاضا ہے کہ ہم اللہ کی عبادت کریں، اس کے لئے نمازیں پڑھیں، اس کی بارگاہ میں قربانیاں پیش کریں، اگر ہم اللہ کی رضا کے لئے نمازیں پڑھیں اور قربانیاں دیں تو ہم پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں، ہمارا دشمن نامراد ہوگا، ہماری دنیا وآخرت بن جائے گی، اور ہر جگہ کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔

نماز میں انسان اپنے وقت، اپنے جسم کو اللہ کے حوالہ کرتا ہے، اور قربانی میں اپنے مال کو اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرتا ہے،، اس طرح یہ دونوں عبادتیں انسان کو مکمل مسلمان بناتی اور اللہ کے قریب کرتی ہیں''۔ (جولائی۔اگست ۲۰۱۸)۔

اس طرح مولانا نے بچوں کی نصابیات پر عظیم کام کیا ہے، اور ان کی پروان چڑھتی سطح کا لحاظ کرتے ہوئے اچھا سلسلہ شروع کیا، وہ نسل نو کی ذہنی وفکری تشکیل میں معاون ہے۔ اللہ تعالی مولانا محترم کو مزید توفیقات سے نوازیں، اور نسل نو کی تعمیر کا عمدہ اور اہم کام لیں۔

یہ ایک مختصر جائزہ ہے، جو ادب اطفال کے سلسلہ میں کی گئی کوششوں کی تاریخ پیش کرتا ہے، اس ادب نے معاشرہ اور سماج پر جو اثر ڈالا ہے، وہ اظہر من الشمس ہے۔ ضرورت ہے کہ تعمیری ادب کی اس صنف کو فروغ میں غیر معمولی دلچسپی لی جائے، اور ہر سطح پر اسے عام کیا جائے۔

❀❀❀

رمز عرفان

سورج نارائن مہرؔ

غلط ہے کہ دیدار کی آرزو ہے
غلط ہے کہ مجھ کو تری جستجو ہے
ترا جلوہ اے جلوہ گر کو بکو ہے
حضوری ہے ہر وقت تو روبرو ہے
جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

ہر اک گل میں بو ہو کے تو ہی بسا ہے
صدا ہائے بلبل میں تیری نوا ہے
چمن فیض قدرت سے تیری ہرا ہے
بہار گلستاں میں جلوہ ترا ہے
جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

حسینوں میں جو حسن وناز و ادا ہے
تو عشاق میں عشق وصل و صفا ہے
مجاز و حقیقت میں جلوہ ترا ہے
جہاں جایئے ایک تو رونما ہے
جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

نہ دل مہر کا جستجو میں حزیں ہے
کہ شہ رگ سے بھی تو زیادہ قریں ہے
غلط نام و صورت حجاب آفریں ہے
مگر آنکھ سے پھر بھی پردہ نہیں ہے
جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

جلیل القدر مربی

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ

ڈاکٹر شفیق احمد خان ندوی

عربی زبان وادب کے نامور استاذ، مایۂ ناز ادیب، بصیرت افروز ناقد اور جلیل القدر مربی مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی ۱۶/جنوری ۲۰۱۹ء کو ۸۵ سال کی عمر میں، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مہمان خانے میں حسبِ معمول تہجد گزاری کے بعد تلاوت قرآنِ مجید کرتے ہوئے باوضو جسمانی وروحانی طہارت کے ساتھ نمازِ فجر کی تیاری میں مصروف مؤذن کی اذان پر لبیک کہتے ہوئے اپنے خالق و مالک کے حضور حاضر ہوگیے؛ اور پھر اپنی جائے ولادت تکیہ رائے بریلی (یوپی) میں اپنے ماموں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی علیہ الرحمۃ والرضوان کے پہلو میں ہمیشہ کے لیے محوِ استراحت بھی ہوگیے۔ قابلِ ذکر ہے کہ مولانا واضح صاحبؒ کی ولادت اسی تکیہ، رائے بریلی میں ۲۰/نومبر ۱۹۳۳ء کو ہوئی تھی۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی صاحب رحمۃ اللہ بھی تو اسی طرح ۲۲/رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ کے آخری عشرے میں (۳۱/دسمبر ۱۹۹۹ء) کو اسی تکیہ شاہ علم اللہ وسید احمد شہید رحمہا اللہ کے دیار میں جمعہ کی نماز کی تیاری کر کے تلاوتِ قرآن کرتے ہوئے ارحم الراحمین سے جاملے تھے۔ اللّٰھم اغفر لھم مغفرۃ واسعۃ۔

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

مولانا سید محمد واضح رشید ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے معتمدِ تعلیم تھے، عربی زبان وادب کی فیکلٹی کے ڈین، فکرِ اسلامی کے اعلیٰ ادارے کے ڈائریکٹر، رابطہ ادبِ اسلامی عالمی کے جنرل سکریٹری، اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ اینڈ پبلیکیشنز کے نائب صدر، پندرہ روزہ عربی جریدہ کے چیف ایڈیٹر اور ماہنامہ البعث الاسلامی کے شریک چیف ایڈیٹر تھے اور درجنوں عربی اردو کتابوں کے مؤلف بھی تھے ۔

چاندنی بے نور گل بے رنگ اور نغمے اداس
اک ترے جانے سے کیا بتلاؤں کیا کیا ہوگیا

مولانا واضح صاحب نے ندوے سے فاضلِ ادب کی سند ۱۹۵۱ء میں حاصل کی تھی اس کے بعد ۱۹۵۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی میں بی اے (پرائیویٹ) پاس کیا اور آل انڈیا ریڈیو دہلی کے عربی یونٹ میں انگریزی عربی مترجم اور اناؤنسر مقرر ہوئے جہاں بیس (۲۰) سال تک مشغول رہے۔ مولانا واضح صاحب سے راقم کا تعلق بہت پرانا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں راقم نے ندوہ سے فاضلِ دینیات کی سند حاصل کر کے دہلی کا رخ کیا تھا، جہاں جامعہ ملیہ میں دو سال ہوسٹل میں رہ کر ہائر سیکنڈری اسکول پاس کیا۔ اس زمانے میں مولانا اجتباء ندوی صاحبؒ جامعہ میں استاد تھے۔

ان کے یہاں مولانا واضح صاحب اور مولانا سید ابوبکر حسنی صاحبؒ سے برابر ملاقات ہوتی تھی اور جب کبھی شہر جاتا، فراش خانے (محلے) میں ان کے گھر بھی جاتا، اس زمانے میں راقم نے آنے جانے والوں کے ساتھ حسنی خانوادے کی ضیافت، اخلاق اور تواضع کے مظاہر دیکھے اور متاثر ہوا۔ ایک بار ۱۹۶۸ء میں پروفیسر عبدالحلیم ندوی اور پروفیسر سید محمد اجتباء ندوی نے عربی تقریروں کا ایک مسابقہ ''دور الطالب في بناء الوطن'' کے نام سے کرایا، اس میں جج کے فرائض مولانا واضح رشید حسنی صاحب اور مولانا ابوبکر حسنی صاحب نے انجام دیے جو بالترتیب آل انڈیا ریڈیو میں مترجم و اناؤنسر اور نہرو انٹرنیشنل سینٹر میں استاد تھے اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے قیام کے بعد اس کے ویسٹ ایشین اسٹڈیز سینٹر میں پروفیسر ہوئے تھے۔ اس مسابقے میں مشہور شامی سفیر و شاعر عمر ابوریشہ کی صدارت میں انھیں کے بدست بحمدللہ اول انعام راقم سطور کو حاصل ہوا تھا، ان دونوں حسنی بزرگوں سے راقم نے نجی ملاقاتوں میں بہت کچھ سیکھا اور یہ دیکھ کر متاثر ہوا کہ ان کا گھر مدارسِ دینیہ کے چندہ مانگنے والوں کا ملجا و ماویٰ ہے۔ ضیافت وسخاوت اور تواضع کا یہ سلسلہ مولانا ابوبکر حسنی کی وفات کے بعد بھی ان کے داماد (راقم کے ندوی کلاس فیلو دوست) خالد حسنی ندوی کے ذریعہ ایک زمانے تک جاری رہا۔

واضح صاحب صحیح معنوں میں متقی تھے، خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کی صفات سے متصف متقی اور مرد مؤمن۔ مجھے یاد ہے ۱۹۷۳ء کا زمانہ جب میں علی گڑھ میں ایم اے کا طالب علم تھا؛ اور حضرت مولانا علی میاں علیہ الرحمہ سے ملنے تکیہ گیا ہوا تھا۔ حضرت مولاناؒ کے حضور باادب بیٹھا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، جستجو ہوئی کہ کون ہے؟ معلوم ہوا کہ مولانا سید محمد واضح رشید حسنی صاحب ہیں جب اپنی ریڈیو کی ۲۰/سالہ ملازمت چھوڑنے کی اجازت حضرت مولاناؒ سے طلب کر رہے ہیں اور وجہ یہ بتا رہے ہیں کہ یہاں اکثر خلافِ واقعہ باتوں کا ترجمہ کرنا پڑتا ہے اور انھیں نشر بھی کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد میں تو اپنے گاؤں رستہ مؤضلع رائے بریلی (جو اب ضلع امیٹھی میں ہے) واپس چلا آیا۔ چند روز بعد ہی معلوم ہوا کہ مولانا واضح صاحب ریڈیو کی بڑی تنخواہ چھوڑ کر ندوہ آ گئے اور مفت پڑھانے لگے، جہاں ایک عرصے کے بعد قدرِ کفاف سے بھی کم مشاہرہ دیا جانا منظور ہوا۔ میں دنگ رہ گیا؛ کہ اس زمانے میں بھی تقویٰ اور عزیمت کی راہ پر چلنے والا کوئی تو نظر آیا۔

کچھ ہی دن بعد واضح رشید حسنی کے نام سے مضامین مجلہ ''البعث الإسلامي'' اور صحيفة ''الرائد'' میں شائع ہونے لگے، جو بعد میں ''صور و أوضاع''، ''أنباء و تعليقات'' اور ''افتتاحية الرائد'' کے مستقل عناوین کی شکل اختیار کر کے عربی زبان کے طلبہ واساتذہ کی توجہ اور استفادہ کے وسیلے بنتے گیے۔ مجھے واضح صاحب کی نگارشات اور ان کے اسلوبِ بیان سے خصوصی دلچسپی رہی ہے کیونکہ ان کی تعبیرات انگریزی عربی کے قدیم وجدید اندازِ بیان اور سادگی و پرکاری کا حسین امتزاج ہوا کرتی تھیں:

سادگی و پرکاری بے خودی و ہوشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا
(غالبؔ)

حسن الحضارة مجلوب بتطرية
وفي البداوة حسن غير مجلوب
(المتنبّي)

مولانا واضح صاحب نے البعث اور الرائد کے معیار کی بلندی میں اہم رول ادا کیا، حتیٰ کہ وہ حضرت الاستاذ مولانا سید محمد

رابع حسنی ندوی، استاذ گرامی مولانا سعید الاعظمی ندوی کا دستِ راست بن گئے؛ اسی طرح جس طرح ہوا کرتے تھے مجلة البعث الإسلامي کے مؤسس اور پہلے چیف ایڈیٹر سید محمد الحسنی مرحوم مؤلف کتاب الإسلام الممتحن۔ مجھے یاد ہے ۱۹۵۹ء کا زمانہ جب میں ندوۃ العلماء کے دوسرے درجے کا طالب علم تھا، حضرت مولانا محمد رابع حسنی اور حضرت مولانا سعید الاعظمی نے پندرہ روزہ صحیفہ ''الرائد'' نکالا۔ میں ان کے ساتھ لگا رہتا تھا اور ''الرائد'' کے بنڈل پوسٹ کرنے اکیلے ہی چار باغ لکھنؤ اسٹیشن جایا کرتا تھا۔ خریداروں کے نام پتے بھی اپنے ہاتھ سے لکھا کرتا تھا۔ قاری علیم صاحب مرحوم کی دستی کتابت سے کسی طرح بہ مشکل تمام یہ پرچہ چھپتا اور شائع ہوتا تھا۔

بارہ چودہ برس کے بعد جب مولانا واضح صاحب ریڈیو کی نوکری چھوڑ کر ندوے آئے تو ''الرائد'' کی قسمت جاگی۔ واضح صاحب نے اسے ملون رسالے کی شکل دی۔ صفحات میں اضافے کیے۔ افتتاحیہ مولانا رابع صاحبؒ کے قلم سے اور کلمۃ العدد مولانا سعید الرحمن اعظمی صاحب مدظلہ کے قلم سے شائع ہوتے رہے۔ باقی دیگر مضامین اور مستقل عنوانات خصوصاً ''أنباء و تعليقات'' و ''صور و أوضاع'' نئی نسل کی ہمہ گیر تربیت کا سامان فراہم کرنے لگے۔ اس طرح مولانا سید محمد واضح رشید حسنی نے سرزمین ہند کی عربی صحافت کو عالمِ عرب کے وسیع وعریض آسمانوں تک پہنچایا۔

مولانا واضح کی درج ذیل عربی وارد کتابیں موجود و میسر ہیں جن کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ امتِ مسلمہ کی ہمہ گیر تربیت کے متلاشی تھے، محض تدریس اور تعلیم پر اکتفاء کرنے کے قائل نہ تھے:

(۱) إلى نظام عالمي جديد (۲) من قضايا الفكر الإسلامي: الغز والفكري (۳) تاريخ الأدب العربي في العصر الجاهلي (۴) أعلام الأدب العربي في العصر الحديث (۵)مصادر الأدب العربي (۶) أدب أهل القلوب (۷)تاريخ الثقافة الإسلامية (۸) الرحلات الحجازية ومناهج كتابها في العصر الحديث (۹) أدب الصحوة الإسلامية (۱۰) محمد رسول اللّٰه وصحابته رضى اللّٰه عنهم (۱۱) الشيخ أبوالحسن علي الحسني الندوي قائدا حكيما (۱۲) ابوالحسن علي الندوي: منابع فكره ومنهجه (۱۳) من صناعة الموت إلى صناعة القرارات (۱۴) حركة رسالة الإنسانية (۱۵) حركة التعليم الديني وتطور المنهج (۱۶) محسن انسانیتؐ (۱۷) سلطان ٹیپو شہید - ایک تاریخ ساز قائد (۱۸) مسئلۂ فلسطین (۱۹) ندوۃ العلماء - ایک رہنما تعلیمی مرکز اور تحریکِ اصلاح ودعوت (۲۰) نظامِ تعلیم وتربیت: اندیشے، تقاضے اور حل (۲۱) اسلام - تکمیلِ نظامِ زندگی (حدیث نبوی کی روشنی میں) (۲۲) انسانی حقوق (قرآن وحدیث اور سیرت کی روشنی میں) (۲۳) فضائل القرآن الكريم (شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کی اردو کتاب کا عربی ترجمہ) (۲۴) فضائل الصلاة على النبيﷺ (شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کی اردو کتاب کا عربی ترجمہ) (۲۵) الدين والعلوم العقلية (مولانا عبدالباری ندوی کی اردو کتاب کا عربی ترجمہ)۔

یہ ہے مولانا واضح صاحب کا علمی ادبی وتربیتی ورثہ جو ان شاء اللہ علمِ نافع کے طور پر صدقۂ جاریہ بن کر ان کی مغفرت اور ترقی درجات کا باعث بنے گا۔ فرمانِ رسالتؐ کے بموجب انسان کے

مرنے کے بعد تین اعمال ضرور باقی رہتے ہیں: (۱) صدقۂ جاریہ (۲) علمِ نافع اور (۳) صالح دعا گو اولاد۔ بنابریں ہم کہہ سکتے ہیں کہ موصوف مولانا محمد واضح کے چھوڑے ہوئے صدقۂ جاریہ اور عام نفع بخش کاموں کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت یافتہ صلبی اور تربوی وروحانی اولاد کا سلسلہ جاری ہے اور ان شاء اللہ ہمیشہ جاری وساری اور زندہ تابندہ ہی رہے گا۔

وہ کلاس روم کی حد تک درس وتدریس میں مشغول مدرس تو تھے ہی، درس گاہ کے حدود میں جاری مفید ونافع خصوصی وعمومی درسی وغیر درسی سرگرمیوں پر گہری نگاہ رکھنے والے معلم اور نگراں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جلیل القدر دانا وبینا مربی تھے جن کا مقصود ہمہ گیر وجامع شبانہ روز تربیت تھی، ذہنی وفکری، ادبی، ذوقی، جمالیاتی، شخصی وجسمانی، اخلاقی وروحانی تربیت اور شخصیت سازی جس کو كلية التربية Faculty of Education کا اصلی ہدف مانا جاتا ہے۔ اس طرح کی جامع تربیت کے بغیر کوئی استاذ مدرس تو ہوسکتا ہے، معلم بھی ہوسکتا ہے، مربی نہیں۔ حضرت الاستاذ مولانا واضح صاحبؒ صحیح معنوں میں مربی تھے، خاموشی، سادگی، فرض شناسی، اعتدال پسندی، خوش اخلاقی، خدا ترسی، خود احتسابی، پاکیزگی، علم وعمل کی باہمی تطبیق اور اچھے کاموں میں دوسروں کی حوصلہ افزائی جن کی بنیادی صفات تھیں۔ اس موقع پر چھوٹوں کی ہمت افزائی کا ایک واقعہ بطور مثال میں بیان کرنا چاہوں گا۔ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ دہلی میں حسین حسنی صاحبؒ کے گھر حضرت الاستاذ مولانا رابع صاحبؒ اور مولانا واضح صاحبؒ تشریف فرما تھے۔ عصر کے بعد کی مجلس میں مولانا واضح صاحبؒ نے راقم کی طرف متوجہ ہوکر حضرت مولانا رابع صاحب اور دیگر لوگوں کے سامنے کہا: ''شفیق! تمہاری کتاب ''العربية الوظيفية Functional Arabic'' میں نے دیکھی؛ اچھی کتاب ہے۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ ندوہ کے طلبہ کو اس سے فائدہ کس طرح پہنچایا جائے۔'' یہ تھا ہمارے استاد کی پدرانہ شفقت وتربیت کا اندازِ کریمانہ!!

۞۞۞

موجِ نسیمِ مصطفی

جناب علیم ناصری

موجِ نسیمِ مصطفی پھیل گئی چمن چمن
جس سے مہک مہک گئے لالہ وگل کے پیرہن

بادِ بہارِ مجتبیٰ ہر سو سنک سنک گئی
وجد میں لہلہا اٹھے سنبل وسوسن وسمن

اس کے جلال کی جھلک تیغِ جلالتِ عمر
اس کے جمال کا ظہور جذبۂ عارفِ قرن

تیرہ وتار تھا جہاں، راہِ ہدیٰ عدم میں تھی
دہر کو جگمگاگئی اس کے جمال کی کرن

وارثِ تختِ جم ہوئے سرورِ دیں کے سرفروش
فاتحِ روم و رے ہوئے داعیِ حق کے تیغ زن

باعثِ بہجتِ تمام اس کی نگاہِ التفات
وجہِ زیاں تمام تر اس کی جبیں کی اک شکن

دیکھئے کب ملے اسے حسنِ قبول کی سند
اس کے ثنا گروں میں ہے ایک علیمؔ کج سخن

قصہ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
(شکوہ اور جواب شکوہ کی روشنی میں)

مولانا محمد علاء الدین ندوی

خودی سے سرشار اقبال، خوف خدا سے لرزاں ترساں اقبال ، دعا و مناجات میں رطب اللسان اقبال شکوہ و شکایت، نالہ و فریاد اور قصۂ درد سنانے پر آتا ہے، تو کیا آداب خداوندی تک بھول جاتا ہے؟ اقبال محرم راز ہے، وہ اپنے ''دوست'' سے گستاخی اور محاذ آرائی نہیں کرسکتا عشق و محبت سے سرشار انسان اپنے محبوب و مطلوب کے حضور میں تحکمانہ انداز میں بات نہیں کرسکتا۔ اصل یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی موجودہ پستی سے دل گرفتہ ہے، اس کا رواں رواں غم دوراں میں ڈوبا ہوا ہے، اس لئے خدا کے حضور اس کا لب ولہجہ جذباتی، خطیبانہ اور بے باکانہ ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر انیس چشتی نے کہا: '' ان کا یہ رونا دھونا اور شکوہ و شکایت کے یہ دفتر جو کھولے گئے ہیں، ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ ان کی آہوں کی تڑپ، ان کا سوز دروں نو جوان نسل میں منتقل ہو جائے۔''(۱)

جوانوں کو میری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا ! میری آرزو یہی ہے
میرا نور بصیرت عام کر دے

ہر چند کہ انداز شکوہ کا اختیار کیا گیا ہے، مگر امت مسلمہ کے عظیم الشان کارناموں کو اس حسن ترتیب، دلکش اور طاقتور اسلوب میں پیش کیا گیا ہے کہ مومن کی قوت عمل میں تازگی، عظمت رفتہ کو پانے کی خواہش اور ہمت و ارادے کا جوش وجذبہ امنڈ پڑا ہے۔

بال جبرئیل کی عمارت عشق عمل اور خودی پر قائم ہے، مگر یہ بنیادی لوازم بانگ حرا ہی میں جلوہ گر ہو چکی تھیں۔

یورپ کے قیام کے دوران علامہ نے مغرب کی تخریبی تہذیب کا مطالعہ بڑی عمیق نگاہوں سے کیا تھا، اس مطالعے اور اسلامی تعلیمات پر غور وفکر کے بعد ان کا یہ اذعان و یقین مزید پختہ ہوگیا کہ دنیا کی فلاح کا ذریعہ صرف اسلامی تعلیمات میں مضمر ہے، مگر صد افسوس کہ فکری اعتبار سے خود مسلمان بدحال اور عملی اعتبار سے تباہ حال ہیں۔ سوء اتفاق کہ وہی وقت عالم اسلام میں اتھل پتھل اور کرب و بے چینی کا رہا۔ یورپ کی اسلام دشمن طاقتیں عالم اسلام پر شب خون مارتی رہیں اور اپنے فکری اور عسکری حملوں سے اسے زیر کرتی چلی گئیں۔ ہندوستان میں انگریزوں کی ریشہ دوانیاں نقطہ عروج پر تھیں۔ ۱۹۰۸ء میں روس اور برطانیہ نے ایران پر اپنا تسلط قائم کرلیا تھا اور وہاں کے داخلی معاملات میں دخل اندازی شروع کر دی تھی مسلم حکومتیں بھی یورپ کی استعماریت و استبدادیت سے خوں چکاں تھیں۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی طرابلس کو اپنے مظالم کا نشانہ بنا چکا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں برطانیہ کے اشارے پر بلقانی ریاستوں نے ترکوں

کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا۔ترکی سلطنت ایک بوڑھی اور بیمار حکومت کی حیثیت سے اپنا بوجھ ڈھوئے چلی جا رہی تھی اور اس کا شکوہ اور دبدبہ پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ ان حالات سے ہندوستانی مسلمان بیحد متاثر تھے اور جنگ بدر کی طرح نصرت غیبی کے خواہاں تھے لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی شنوائی اور مدد نہیں ہو رہی ہے، اس ذہنی اضطراب اور مایوسی کے نتیجے میں مسلمان اپنے حالات درست کرنے کے بجائے خدا پر نکتہ چینی کرنے لگے۔‘‘(۲)

مایوسی اور بے عملی کی اس فضا میں علامہ اقبال انگلستان سے واپس آئے ،تو نئی سوچ اور شاعری کے نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ آئے ، دل گرفتہ تو تھے ہی ،مگر وہ خدا شناس اور مہم شاعر تھے، اپنی دل گرفتگی اور اپنے تاثر کو شکوہ کی شکل دی ، جسے انہوں نے اپریل ۱۹۱۱ء میں حمایت الاسلام کے جلسے میں سنایا۔موضوع کے لحاظ سے اس نظم کا نام شکوہ رکھا گیا، کیونکہ یہ ایک فریاد ہے جسے بارگاہ الٰہی میں پیش کیا گیا ہے، علامہ اقبال کہتے ہیں کہ ہم تیرے اور تیرے نبی کے نام لیوا ہیں،مگر تیری نوازشات اور انعامات کے مستحق غیر مسلم ہیں اور ہمارے نصیبے میں ذلت وخواری آئی ہے؟ دراصل اقبال نے عام مسلمانوں کے لاشعوری احساسات کی ترجمانی کی ہے۔

سلیم احمد کہتے ہیں:’’ایک طرف ان کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ خدا اور اس کے محبوب کی سب سے چہیتی امت ہیں اور دوسری طرف یہ نا قابل تردید حقیقت ہے کہ ان کا مکمل زوال ہو چکا ہے، عقیدے اور حقیقت کے اس ٹکراؤ سے مسلمانوں کا وہ مخصوص المیہ پیدا ہوتا ہے جو ’’شکوہ‘‘ کا موضوع ہے۔‘‘(۳)

شکوہ میں مسلمانوں کی پستی کا گلہ ہے،تو جواب شکوہ میں اس سے ابھرنے کی ترکیب بتائی گئی ہے۔پستی و بے وقعتی کا گلہ کچھ اس انداز سے کیا گیا ہے کہ نظم افسردگی اور پژمردگی پیدا نہیں کرتی، بلکہ اس لئے مسلمانوں کے عظیم الشان کارناموں کا فخریہ تذکرہ حوصلہ پیدا کرتا ہے۔نظم میں قوت عمل، تازگی ، جوش و ہمت کی شان بہت نمایاں ہے۔ شاعر کا مفکرانہ اور فنکارانہ کمال ہے کہ نا خوشگوار حالات اور ذلت و پستی کے ماحول میں عظمت رفتہ کا بیان قاری کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی کہتے ہیں:’’شکوہ اردو ادب میں ایک انوکھی چیز ہے،ندرت تخیل کے علاوہ حقیقت نگاری اور شاعرانہ رو اور تخیل کے مصوری کی شان بدرجہ اتم موجود ہے، اس نظم میں اقبال نے لفظوں کے ذریعے سے مسلمانوں کی تاریخ کی تصویر کھینچی ہے موئے قلم سے ایسی رنگ آمیزی کی ہے کہ حقیقت مجسم سامنے آجاتی ہے،شکوہ کی زبان اس قدر دلکش اور اشعار کی سلامت اور روانی کا یہ عالم ہے کہ پڑھنے والے پر محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔‘‘(۴)

شکوہ اور جواب شکوہ دیگانہ طنزیہ فلمیں ہیں، یہ ایک قد آدم آئینہ ہے، جو مسلمانوں کو ان کا صحیح چہرہ دکھاتا ہے،طنز کے پردے میں تعلیم تلقین ، اصلاح اور ہمدردی کارفرما ہے، اصل یہ ہے کہ طنز کی گہری چوٹ انسان کے اندر تبدیلی کے احساس کو دو چند کر دیتی ہے۔شکوہ میں شکایات کا دفتر کھول کر زوال مسلم کو آشکارا کیا گیا ہے اور جواب شکوہ میں عزت وسرخروئی کے راز سے پردہ ہٹایا گیا ہے۔

محمد بدیع الزمان کہتے ہیں:

’’اقبال کی سب سے طویل طنزیہ نظم شکوہ ہے، اس میں جس شاعرانہ انداز میں مسلمانوں کی پستی کا گلہ خدا سے کیا گیا ہے اور جواب شکوہ میں ابھرنے کی جو ترتیب بتائی گئی ہے اس میں الہام ربانی کی شان نظر آتی ہے، اس طنز کے ذریعہ اقبال نے خدا اور انسان کے رشتے کو استوار کیا ہے، اس میں انہوں نے خدا سے شوخی کی ہے۔‘‘(۵)

گوناگوں ضمنی لہجئے، فکروخیال کی ترتیب اور مضامین کے تنوع کے لحاظ سے جس میں کہیں عجز و نیاز مندی ہے، کہیں غیرت وانانیت کا احساس ہے، کہیں تندی وبلیتی ہے کہیں ناز اور شوخی ہے کہیں تأسف اور افسردگی کا لہجہ ہے، کہیں گریہ وزاری اور کہیں دعائیہ انداز ہے، شکوے کو ہم نے چند حصوں میں تقسیم کیا ہے:

تمہیدی حصہ: یہ دو بندوں پر مشتمل ہے، اقبال کے خیال میں مسلمان اب زوال وانحطاط کی اس منزل کو پہنچ چکے ہیں کہ اس کے بعد اب مزید ان کی بربادی کا تماشا نہیں دیکھا جا سکتا، اب قصۂ درد سنائے اور نالہ وفریاد کئے بغیر رہا نہیں جا سکتا، جب خدا نے مجھے قوت گویائی عطا فرمائی ہے تو پھر کیوں نہ ''دوست'' کو اپنی روداد غم سناؤں، چنانچہ شاعر نے خدا سے التجا کی کہ اے خدا! حمد وثنا کے خوگر بندوں سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے، کہ اب ہمارے اندر اپنے درد و کسی کو ضبط کرنے کا یارا نہیں رہا ؎

جرأت آموز میری تاب سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو (بند:۱)
اے خدا شکوۂ ارباب وفا بھی سن لے
خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے (بند:۲)

شکوہ کا دوسرا حصہ: یہ گیارہ بندوں پر مشتمل ہے، جس کا آغاز اس طرح ہوا ہے ؎

تھی تو موجود ازل ہی سے تیری ذات قدیم
پھول تھا زیب چمن پر نہ پریشان تھی شمیم (بند:۳)

اس پورے حصے میں شکوہ نام کی کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ امت مسلمہ کے عظیم الشان کارناموں کا تذکرہ ہے کہ ہم مسلمانوں نے دنیا کو تیرے نام اور صفات سے آگاہ کیا، ہم نے توحید کا علم بلند کیا دنیا پرسوکی پرستش کی عادی تھی، جان ہتھیلی پر رکھ کر ہم نے تیرے نام کا آواز بلند کیا اور تیرے پیغام کو عام کیا، ہم نے تیری عظمتوں کی خاطر دنیا والوں سے دشمنی اور لڑائی مول لی بھی ہم یورپ سے برسر پیکار رہے، کبھی ہم نے خوشکیوں اور سمندروں میں تیری عظمت کا ڈنکا بجایا بت شکنی ہمارا طرۂ امتیاز رہا، تاہم بت فروشی سے کبھی ہم نے اپنا رشتہ اپنا رشتہ ناطہ نہیں جوڑا، ہمارے علاوہ اور کون ہے جس نے تجھ سے محبت کی اور تیرے رسول اکرم کی عزت و ناموس کے لئے اپنا خون مدا بہایا۔ یہاں اقبال مسلمان قوم کا ترجمان بن کر شدومد اور فخر کے ساتھ یہ دعوی کرتا ہے کہ مسلمانوں نے دنیا کی جاہل امتوں اور بیما رقوموں کے سامنے وہ نسخۂ شفا پیش کیا جو توحید میں مضمر ہے ؎

تجھ کو معلوم ہے، لیتا تھا کوئی نام تیرا
قوت بازوئے مسلم نے کیا کام تیرا (بند:۴)
بس رہے تھے یہی سلجوق بھی تورانی بھی
اہل چین، چین میں ایران میں ساسانی بھی (بند:۵)
اس معمورے میں آباد تھے یونانی بھی
اسی دنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی
پر تیرے نام پہ تلوار اٹھائی کس نے؟
بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے؟
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیر خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے (بند:۸)
دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے (بند:۱۲)
صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوع انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے (بند:۱۳)
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

تیسرا حصہ: امت مسلمہ کے درخشاں ماضی کی عظیم و حسین جھلکیاں دکھانے کے بعد اب تیسرے حصے میں نظم کا رخ مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی کی طرف مڑ جاتا ہے، یہ پورا حصہ شکایتوں پر مبنی ہے، اقبال شکوہ کرتے ہیں کہ دنیا میں ہر جگہ مسلمان غیر مسلموں کے مقابلے میں حقیر و ذلیل اور بے آبرو ہیں، ہر چہار جانب وہ جبر و استبداد کا نشانہ بنائے جا رہے ہیں، ان کی یہ حالت زار دیکھ کر دوسری قومیں تک خندہ زن ہیں، کفار تیر و نشتر چلا رہے ہیں، اسلام کی ہنسی اڑائی جا رہی ہے، غیروں کے طعنے سننے پڑ رہے ہیں، ہر چہار سو وہ رسوا ہو رہے ہیں، ناداری ان ان کی قسمت بن گئی ہے، وہ خیالی دنیا میں جیتے ہیں، کیا یہی مسلمان ہونے کا صلہ ہے؟!

اے خدا! کیا تجھے توحید کی بقا کا خیال نہیں؟ ہم تو توحید پر قائم رہ کر تیرے نام کو جاوداں رکھنا چاہتے ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ جام کے بغیر ساقی رہ جائے، آج بھی ہم تیرے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامن سے وابستہ ہیں، تکبیر کی چنگاری سے آج بھی ہمارے سینے دہک رہے ہیں، بلالی زندگی سے ہمارا رشتہ قائم ہے، مصائب برداشت کرنا ہمارا شیوہ ہے، دین بھی وہی ہے، امت بھی وہی ہے، مگر کیا بات ہے کہ ہم پہلی جیسی نوازشات اور الطاف کریمانہ سے محروم ہیں، ان شکایتوں کو اقبال کے بلیغ اشعار میں دیکھئے ؎

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر (بند:۱۴)
اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں (بند:۱۶)
طعن اغیار ہے رسوائی ہے ناداری ہے
کیا تیرے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے (بند:۱۷)
ور دلیلی بھی وہی، قیس کا پہلو بھی وہی
نجد کے دشت و جبل میں رم آہو بھی وہی (بند:۲۰)
عشق کا دل بھی وہی حسن کا جادو بھی وہی
امت احمد مرسل بھی وہی تو بھی وہی
پھر یہ آزرد گئی غیر سبب کیا معنی
اپنے شیداؤں پہ یہ چشم غضب کیا معنی
آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثل بلال حبشی رکھتے ہیں (بند:۲۱)

آگے چل کر محبوب حقیقی کے سامنے عاشق شاعر کی شوخی میں ذرا تلخی آ جاتی ہے، وہ کچھ زیادہ ہی بے باکی اور تیکھی زبان میں کہتا ہے مانا کہ ہم عشق و محبت میں اسلاف کا مقابلہ نہیں کر سکتے تسلیم و رضا میں ان کا رنگ نہیں جما سکتے لیکن گستاخی معاف ہو، آپ نے بھی تو اپنے سچے عاشقوں کو فراموش کر دیا ہے اور غیروں سے راہ و رسم اور آشنائی و شناسائی پیدا کر لی ہے ؎

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہر جائی ہے (بند:۲۲)

لہجے اور مزاج کے اعتبار سے یہ قصہ درد کا کلائمکس ہے، اس کے بعد گتھیاں سجھتی چلی جاتی ہیں، جرات آموز شاعر کی تلخی میں کمی آتی ہے، شاعر عنایات ربانی اور صاحب الطاف تمیم کی فیض بخشیوں کو یاد دلا کر سوال کرتا ہے، کہ آخر کوہ فاراں میں طلوع ہونے والے آفتاب سے ہم نے بھی روشنی پائی ہے، تو پھر ہمارے اندر کے ایمان کی چنگاری کیوں شعلہ جوالہ نہیں بنتی؟! ؎

آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں
ہم وہی سوختہ ساماں ہیں تجھے یاد نہیں (بند:۲۳)

شاعر اور نرم پڑتا ہے، وہ دھیمی لے اور شفقت آمیز اسلوب اختیار کر کے فیضان سماوی سے محرومی کی تفصیل بیان کرتا ہے، دعا کی کرتا ہے، دعا کے لئے زبان کھول دیتا ہے، خدا کی نگاہ کرم کا سوالی بنتا ہے، یہاں شاعر پہ پوری طرح سے متانت اور سنجیدگی چھا جاتی ہے، وہ راز و نیاز کرنے لگتا ہے، اور عاجزی و فروتنی کے ساتھ اپنی شکایت کے جواز کو تفہیم کے انداز میں پیش کرتا ہے ؎

اپنے پروانوں کو پھر ذوق خود افروزی دے
برق دیرینہ کو فرمان جگر سوزی دے (بند:۲۵)

اے خدا! تیرے بندے اپنی غلطیوں پر نادم ہیں اور تیری نوازشوں کے منتظر ہیں، انہیں آتش عشق میں جلنے کی طاقت دے، وہ تو تیری راہ میں شہادت کا لہو بہانے کے لئے اور تیرے دین کو دنیا میں غالب کرنے کے لئے تیار ہیں ؎

قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز
لے اڑا بلبل بے پر کو مذاق پرواز (بند:۲۳)
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز
تو ذرا چھیڑ تو دے تشنہ مضراب ہے ساز

....

نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لئے
طور مضطر ہے اس آگ میں جلنے کے لئے (بند:۲۶)
مشکلیں امت مرحوم کی آسان کر دے
مور بے مایہ کو ہم دوش سلیماں کر دے
جنس نایاب محبت کو پھر ارزاں کر دے
ہند کے دیر نشینوں کو مسلماں کر دے (بند:۲۷)

یہاں اقبال کا روئے سخن خاص طور پر ہندی مسلمانوں کی طرف ہے، یوں تو مسلمان دنیا کے گوشے گوشے میں بدحالی، مایوسی اور ابتری کے شکار اور اعداء اسلام کے نشانے پر ہیں، مگر برصغیر میں تو ان کی زبوں حالی، اور انتشار و پراگندگی نقطۂ عروج پر پہنچ چکی ہے، اس لئے شکوہ اور جواب شکوہ دراصل برصغیر کے مسلمانوں کے درد و الم کی ترجمانی ہے۔

یہ بہت ہی بلیغ شعر ہے، ہندوستان میں ہزاروں سال سے مسلمان رہتے آئے ہیں اور یہاں کی ثقافت اور فلسفے سے متاثر ہو گئے ہیں، دینی کی تعبیر اختیار کر کے ان کو بت پرست ثابت کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ ان کو جدید ایمان کی دعوت دینا ہے، اقبال نے اپنا یہ خیال جگہ جگہ ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان کے سارے مسلمان اگر حقیقی معنوں میں مسلمان بن جائیں تو ساری دنیا کو فتح کر سکتے ہیں، شاعر کی یہ دلی تمنا دعا کی شکل میں ڈھل جاتی ہے، فرماتے ہیں ؎

مشکلیں امت مرحوم کی آساں کر دے
مور بے مایہ کو ہمدوش سلیماں کر دے (بند:۲۳)

اس حصے میں شکوہ و شکایت اور نالہ و فریاد ختم ہو جاتا ہے، باقی کے تین بندوں میں اپنی قوم کی پستی اور زوال کو دیکھ کر شاعر اپنی طبیعت کے الجھاؤ، جذبات کی رستاخیزی، قوم کی ناراضگی، اور بے اعتنائی کا نقشہ پیش کرتا ہے اور حزن و یاس اور درد و الم کے ساتھ پکار اٹھتا ہے ؎

لطف مرنے میں ہے باقی، نہ مزا جینے میں
کچھ مزا ہے تو یہی خون جگر پینے میں (بند:۳۰)

غلبۂ یاس و حرمان کے باوجود شاعر دین برحق کی جو خدمت کر سکتا تھا اس سے دریغ نہیں کرتا، ''کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی۔ آخر میں شاعر اس حقیقت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہتا کہ اگر چہ میں عجمی طریقے پر شعر کہتا ہوں، ایرانی روایات کا پابند ہوں، ہندی تو الاصل ہوں لیکن اسلامی روح سے آشنا ہوں، اگر میرے کلام کا نائر

مطالعہ کیا جائے تو اسلامی حقائق ومعانی جھلملاتے نظر آئیں گے شکوہ کا یہ حصہ اس بلیغ معنی خیز اور اظہار تعلّی پر ختم ہوتا ہے ؎

عجمی خُم ہے تو کیا ، مے تو حجازی ہے میری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے میری
مشکلیں امت مرحوم کی آساں کر دے
مور بے مایہ کو ہمدوش سلیماں کر دے (بند:۲۳)

جواب شکوہ:

شکوہ جیسی یگانہ نظم کے منظر عام پہ آنے کے ڈیڑھ دو سال بعد اقبال نے جواب شکوہ لکھی اور اسے بھی حمایت اسلام کے جلسے ۱۹۱۳ء میں پیش کی، ایک ایک شعر نیلام کیا گیا اور اس سے جو گراں قدر رقم جمع ہوئی اسے بلقان فنڈ کے سپرد کر دی گئی۔ شکوہ میں شکایت کی جرأت در دراصل اس ناز دانداز اور محبت ووارفتگی کا شاخسانہ تھی جس سے شاعر کا دل معمور اور جس کی غیرت دینی احساس زیاں کے درد سے بے چین تھی، چنانچہ وہ فخریہ کہتا ہے ؎

عشق تھا فتنہ گر دسرکش و چالاک میرا
آسماں چیر گیا، تائی بے باک میر (بند:۲۳)

شکوہ میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا اظہار تھا، دل شکستی کی ایک کیفیت تھی، جواب شکوہ میں اس دل شکستگی اور کیفیت کی توجیہ ہے عمل جراحی ہے، جس کا مقصد اصلاح ہے، جستجوئے آرزو ہے، ''لوٹ پیچھے کی طرف اسے گردش ایام تو''۔ محمد بدیع الزماں کہتے ہیں:

''یہ نظم ایک بڑے ذہن کا درد ودانے اور جستجوئے آرزو ہے، اس میں سیکڑوں چبھتی ضربیں اور ہزاروں کھلے نشتر ہیں، جو ردعمل ہیں ملت اسلامیہ کی انتہائی پستی اور دین سے بے رغبتی کا، اس میں لطافت اور مٹی کے عناصر ہی صرف شامل نہیں ہیں، بلکہ اس میں ایک خوش آن مستقبل کا پیغام بھی ملتا ہے، اس میں کہیں خطیبانہ ہیجان وطغیانی ہے، تو کہیں ہلکی تارانگی کا اظہار مگر ہمدردی کا جذبہ ساری نظم میں یکساں ہے۔

اقبال نے اس نظم میں ایک ہوش مند فلسفی اور باکمال شاعر کی طرح اپنی نصیحتوں کو دلائل اور نشیب وفراز کے اصولوں سے پر تاثیر بنا کر غیبی آواز میں عام مسلمانوں کو بیدار کرنے اور راہ عمل پر گامزن کرنے کی کوشش کی ہے، اپنے نشتروں سے دکھتی رگوں کو درست کرنے میں انہوں نے بڑے حسن سے کام لیا، لوگوں کو توجہ پا کر پیغمبرانہ انداز میں گفتگو کی اور دوٹوک باتیں کہیں اور اس طرح مسلمانوں کے ذہنی اور عملی تعطل اور ان کے غیر اسلامی عقائد وشعائر کی بنیادوں کو ہلا ڈالا۔''(۶)

وہ عشق جو جرأت آموز اور نالۂ بے باک کا محرک بنا تھا، وہی عشق اور نالۂ بے باک آسماں چیر کر عرش کی بلندیوں تک جا پہنچا، تو وہاں کے باسیوں میں اس گستاخانہ شکوے سے کھلبلی مچ گئی اور قیاس آرائیاں شروع ہوگئی؛ فرشتے، سیارے، ستارے، چاند، کہکشاں سب حیرت زدہ تھے کہ یہ کون ہے، مگر معلوم نہ کر سکے، ہاں رضوان سمجھ گیا کہ یہ وہی مسجود ملائک انسان ہے جو جنت سے نکالا گیا تھا ؎

پیر گردوں نے کہا سن کے کہیں ہے کوئی
بولے سیارے سر عرش بریں ہے کوئی
چاند کہتا تھا نہیں اہل زمیں ہے کوئی
کہکشاں کہتی تھی پوشیدہ یہیں ہے کوئی
کچھ جو سمجھا میرے شکوے کو تو رضواں سمجھا
مجھ کو جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

فرشتوں نے خاک کی چٹکی سے بنے اس انسان پر تاسف کا بھی اظہار کیا کہ یہ احمق، نادان اور شوخ وگستاخ انسان جو منطق وفلسفہ میں تو بڑا طاق ہے، مگر عجز کے اسرار اور آداب بندگی سے ایسا کورا کہ اسے بات تک کرنے کا سلیقہ نہیں ؎

ناز ہے طاقت گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو (بند:۴)

یہاں شاعر بتاتا ہے کہ خدا کے بندوں کا ترجمان بن کر اس نے اپنی شیریں سخنی اور عشق ومحبت کے البیلے انداز میں جو درد انگیز افسانہ بیان کیا تھا اسے بارگاہ خداوندی میں قبول کر لیا گیا، بلکہ خدا نے خود اس کے حسن ادا کو جس کا اظہار ارباب وفا اور حمد کے خوگر انسانوں نے دو بندوں میں کیا تھا کے جواب میں فرمایا ؎

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ تیرا
اشک بے تاب سے لبریز ہے پیمانہ تیرا
آسماں گیر ہوا نعرہ مستانہ تیرا
کس قدر شوخ زبان ہے دل دیونہ تیرا
....

شکر شکوے کو کیا حسن ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے (بند:۵)

خدائے ذوالجلال والجمال کی اس مقبول غیبی آواز سے عالم بالا میں ایک سناٹا چھا جاتا ہے۔ وہ شاعر جسے شکایت تھی کہ مسلمانوں کی بدحالی وزبوں حالی کی وجہ سے انہیں الطاف کریمانہ سے محروم رکھا جا رہا ہے، اللہ تعالی اپنی رحمت وشفقت بھرے انداز میں اپنی ازلی فیض رسانیوں کا جواب یوں مرحمت فرماتا ہے ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جو ہر قابل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی وہ گل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈھنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں (بند:۶)

شان کئی سے مراد شاہانہ شوکت اور بادشاہت کی قابلیت ہے۔ کئے ایران کے بادشاہوں کا لقب ہوا کرتا تھا، کیقباد، کینسروغیرہ۔

شکوے کے تیسرے بند سے ۱۳ رویں بند تک شاعر نے مسلمانوں کے قابل فخر کارناموں کی داستان سنائی تھی، پھر پہلو بدل کر ۱۴ رویں بند سے لے کر ۲۰ ربند تک انہی مسلمانوں کی زبوں حالی کا رونا رویا تھا، جواب شکوہ میں اس کے حقیقی اسباب کو بے نقاب کیا جا رہا ہے، یعنی دین سے ان کی بے اعتنائی، ان کے صفوں کی پراگندگی، الحاد، کفر اور لادینی تحریکوں کا ان کے درمیان پروان چڑھنا اور مذہب کی حقیقی روح کا ختم ہو جانا۔ یہاں شکوہ کے ایک ایک دعوی کی تردید کی جارہی ہے۔ تردید کا انداز طنزیہ ہے، اظہار حقیقت میں ذرا تلخی وتندی آگئی ہے۔ ملاحظہ ہو بندے تا ہے۔ ان بندوں کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

تمہاری موجودہ ناگفتہ بہ حالت کی اصل وجہ یہ ہے کہ تم تعلیمات رسول سالی یا ایہام سے برگشتہ ہو گئے ہو، مسلمان کبھی بت شکن تھا تم بت پرست بن گئے ہو بھی وہ اللہ کا عاشق وسودائی تھا تم ہمیں ہرجائی ہونے کا طعنہ دیتے ہو، اگر تمہاری نگاہ میں ہم ہرجائی ٹھہرے تو تم کسی ''یکجائی'' کو خدا کیوں نہ بنا لیتے، نالہ نیم شبی اوسحر خیزی سے تمہیں واسط نہیں، البتہ خواب شیریں اور دوستوں کے ساتھ خرمستی تمہیں بہت عزیز ہے تم نہ کسی فن سے آشنا، نہ علم وہنر سے واقف، نہ تحقیق وجستجو کا ذوق، ہاں کفن بیچ کھانا تمہارا شیوہ اور قبر فروشی تمہارا پیشہ ؎

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن تم ہو
بجلیاں جن پہ ہوں آسودہ وہ خرمن تم ہو
کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن تم ہو
....

ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے (بند:۰۱)

تمہیں بڑا ناز ہے اپنے کارنامے گنوانے کا اگر ان کارناموں کے انجام دینے والے تم نہیں، وہ تو تمہارے اسلاف تھے،تمہاری گستاخانہ جرات کا تو حال یہ ہے کہ تم خدا کی صفت عدل پر اعتراض کر بیٹھے ہو اور گستاخانہ زبان میں تم نے کہا ؎

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملے حور و قصور
اور بے چارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور (شکوہ بند:۱۶)

لیکن سچی بات یہ ہے کہ ؎

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں (بند:۲۱)

فرقہ بندی، مصلحت پسندی، اپنے اسلاف کے طریقوں سے بیزاری تمہارا وطیرہ، مساجد غرباء کے دم سے قائم، رہے اہل دولت تو وہ نشہ دولت میں مدہوش، رسم اذاں رہ گئی ہے، مگر روح بلالی مفقود، وضع قطع میں تم نصاری اور تہذیب وتمدن میں ہندوؤں سے لگا کھانے والے ؎

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں (بند:۱۳)
قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ تو پیغام محبت کا تمہیں پاس نہیں (بند:۱۴)
امرا نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملت بیضا غربا کے دم سے (بند:۱۵)
واعظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی
برق طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے (بند:۱۶)

جوب شکوہ میں اس وقت اور زیادہ کڑواہٹ آجاتی ہے، جب یہ شور مچتا ہے کہ دنیا میں مسلمان مٹتے جارہے ہیں۔

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نا بود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود
وضع میں تم ہو نصاری تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود
یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم کبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو (بند:۱۷)

آخروہ کیسے مسلمان تھے جو جاں شاری کے لئے تیار رہتے تھے تمہیں موت کا خوف کھائے جاتا ہے، وہ خدا سے لرزاں ترساں رہتے تھے نہ تو تمہارے اندر فقر حیدری، ندای دولت عثمانی کیا ہی نہیں کہ بیا نالائق ہو تو باپ کی جائیداد سے عاق کر دیا جاتا ہے ؎

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر از بر ہو
پھر پسر قابل میراث پدر کیوں کر ہو (بند:۱۹)

مسلمانوں کی موجودہ ذلت وخواری کے اسباب کے ضمن میں اقبال نے بڑا کلیدی نکتہ پیش کیا ہے جو قابل توجہ ہے۔تاہم ذیل کے اسباب کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے ؎

حیدری فقر ہے، نے دولت عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے (بند:۲۰)
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے صاحب قرآں ہو کر
تم آپس میں غضبناک وہ آپس میں رحیم

تم خطا کار و خطا بین وہ خطا پوش و کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوج ثریا پر مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلب سلیم
خودکشی شیوہ تمہا را وہ غیور و خود دار
تم اخوت سے گریزاں وہ اخوت پہ نثار
تم ہو گفتار سرا پا ، وہ سرا پا کردار
تم ترستے ہو کلی کو وہ گلستاں بہ کنار

....

اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
نقش ہے صفحہ ہستی پہ صداقت ان کی (بند:۲۲)

ہم نے تمہیں سرداری دی تم نے اسلاف کے طریقے کو چھوڑ کر کفر کی راہ پسند کی ہم شریعت کے ہر بند سے آزاد ہوئے مسجدوں کو آباد رکھنے کے علاوہ تم نے ہر جہاں کو آباد کیا، تمہارے نوجوانوں کے سینے عشق رسول سے خالی ہیں اور تمہاری لڑکیاں بے پردگی کی عادی ہیں، وہ برملا کہتی ہیں عاشق آزاد پھر حجاب رخ لیلی کی پابندی کیسی تم مادیت کی آگ میں جل کر فنا ہو رہے ہو، کاش کہ تم ایمان کی آگ میں جلتے اور محبت کی تب و تاب پیدا کرتے تو یہی آگ تمہارے لئے گزار ابراہیم بن جاتی ؎

آج بھی جو ہوا براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستان پیدا (بند:۲۵)

یہاں پہنچ کر شکوہ سنج شاعر کی شوخی تلقی کا رنگ ہمدردانہ غور و فکر اور لطافت و نرمی کے رنگ میں تبدیل ہوتا نظر آتا ہے اور امید و نیم کا مژدہ سناتا ہے، کہا جاتا ہے؛ موجودہ زبوں حالی سے مایوسی اور افسردگی کی ضرورت نہیں، خون شہداء کی سرخی پھول برسارہی ہے، مصائب کے بادل چھٹتے نظر آتے ہیں، فیروزمندی کی نئی صبح طلوع ہونے والی ہے ؎

دیکھ کر رنگ چمن ہو نہ پریشاں مالی
کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خش و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی
گل بر انداز ہے خون شہدا کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے (بند:۲۶)

آخری حصہ: یہاں سے نظم کا آخری حصہ شروع ہوتا ہے، اگر چہ عالم اسلام اس وقت پریشان کن حالات کے گرداب میں ہے، بالقان نے ترکی پر حملہ کر دیا ہے، بلغاریہ میں شورش برپا ہے، تا ہم گھبرانے کی ضرورت نہیں، مظالم کا یہ عارضی دور ختم ہوگا، مظلوموں کا خون کبھی رائیگاں نہیں جائے گا۔ اسلام کبھی مٹ نہیں سکتا، یہ ممکن نہیں ہے کہ مسلمان تو فنا ہو جائیں، لیکن اسلام باقی رہ جائے، اسلام تو مسلمانوں ہی کے دم سے ہے، بس قدرت تیرے ایثار، حوصلہ، صبر اور استقامت کا امتحان لے رہی ہے ؎

کیوں ہراساں ہے تمہیل فرس اعدا سے
نو رحق مٹ نہ سکے گا نفس اعدا سے (بند:۳۰)

شاعر حوصلہ دیتے ہوئے کہتا ہے، توحید کی چمن بندی صدیوں سال کی جدوجہد کا نتیجہ ہے، یہ باد مخالف کے طوفانی بگولوں سے ویران ہو کر مٹ نہیں سکتا، اے مسلماں تو میدان عمل میں آ اور اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو ؎

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے (بند:۱۳)

بس شرط اولیں یہ ہے کہ عشق رسول میں فنا ہو جا تمہاری ہر کمزوری طاقت میں بدل جائے گی ؎

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے

دہر میں اسم محمد سے اجالا کر دے (بند:۳۲)

یادرکھو! اگر تم نے اپنی زندگی سے اسم محمد کو نکال دیا تو تم بھی گم کردہ راہ ہو جاؤ گے اور تمہاری دنیا بھی تیرہ و تار ہو جائے گی تمہاری قسمت اور دنیا کی رونق آپ ﷺ ہی کے اسم سے ہے، آپ نہ ہوں تو کوئی توحید کا نام لینے والا نہ ہو، نہ دین اسلام کا غلغلہ ہو، نہ تمہاری کوئی شان باقی رہے، اسلام کے جسم کی نبض میں حرکت اور قلب میں نور آپ کی وجہ سے ہے ؎

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمن دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
نہ یہ ساقی ہو تو پھر سے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزم توحید جو دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

جواب شکوہ کا اختتام خدا کے اس جواب سے ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ہم نے دو نعمتیں دی ہیں؛ ایک عشق کی تلوار (طاقت) اور دوم عقل کی سپر (دولت)، لہٰذا تو عشق کی تلوار چلا اور مقتل کو ڈھال بنا کر میری مرضی پہ جاں نثار ہو جا، میں تیری آرزو پوری کروں گا ؎

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری
مرد در دیش اخلافت ہے جہانگیر تری
ما سوا اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تک بیر تری
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں (آخری بند)

محمد بدیع الزماں کہتے ہیں:

''اس دنیاوی چمن بندی میں ایسے بلبل کا ہونا ضروری ہی نہیں بقائے عالم کے لئے ناگزیر ہے، جو نا مساعد حالات میں توحید کے نغمے گا گا کر لوگوں کو بیدار کرنے کی کوشش میں مصروف ہو۔'' (۷)

نعت ہی کے ضمن میں اقبال جواب شکوہ کے آخری حصے میں وضاحت کرتے ہیں کہ جہاں میں اسم محمد کا اجالا دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل چکا ہے، یہ نتیجہ ہے عشق رسول کا اور اسی عشق رسول کی بدولت غیبی نصرت آکر رہے گی، یہ ایک اٹل کلیہ ہے، کہ عشق رسول اختیار کرو اور دنیا میں سرخروئی سے ہم کنار ہو جاؤ ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

''پیغام اور نظم کا اختتام ایک ساتھ ہوتا ہے۔ شکوے اور اس کے تمام جوابات ذہن سے محو ہو جاتے ہیں اور صرف آخری شعر زبان پر رہتا ہے اور دل و دماغ پر مترا میں لگا تار ہتا ہے، شکوہ کرنے والا مطمئن ہی نہیں ہو جاتا محو حیرت ہو جاتا ہے کہ صرف دنیا کی سرخروئی کا مطالبہ کیا تھا اور جواب میں لوح و قلم تک حوالے کرنے کی بات کہہ دی گئی، سناٹا چھا جاتا ہے، شا کی پشیمان ہو جاتا ہے لیکن یہی آخری شعر اس کو پست ہمت ہونے سے بچا بھی لیتا ہے اور نیا حوصلہ اور ولولہ عطا کرتا ہے، یہی اقبال کا مقصد و منشا اور دونوں نظموں کو ایک لڑی میں پرونے کا کمال تھا۔'' (۸)

حواشی:

(۱) اقبال کا ادبی اور تہذیبی ورثہ، ص: ۱۵۳، انیس چشتی، ایجوکیشنل پبلشنگ، دہلی
(۲) اقبال فکر وفن، ص: ۹۸، ڈاکٹر سید محمد ہاشم، شعبۂ اردو علی گڑھ
(۳) انٹرنیٹ ''شکوہ''
(۴) شرح بانگ درا، ص: ۱۴۹۳، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی
(۵) صہبائے مسلمانی، ص: ۶۰، محمد بدیع الزماں، دانش بکڈپو
(۶) کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں ص ۲۰-۲۱، محمد بدیع الزماں
(۷) اقبال فکر وفن، ص: ۱۳۴ (۸) ایضاً، ص: ۱۳۴

حضرت مولانا شاہ محمد عبد الرحیم نقشبندی مجددیؒ

اپنے ملفوظات ومواعظ کی روشنی میں

مولانا اقبال احمد ندوی

اِس میں دورائے نہیں کہ ادب ایک عظیم طاقت ہے جس کی اہمیت اور قوت وتاثیر ہر زمانے میں مسلم رہی ہے۔لیکن یہ دودھاری تلوار کی مانند ہے جو کاٹتی بھی ہے اور جان بھی بچاتی ہے۔ یہی حال ادب کا بھی ہے کہ اُس سے تعمیر کا کام بھی لیا جاسکتا ہے اور تخریب کا بھی۔ جو معاشرے کو صالح اور نیک بھی بناتا ہے اور دوسری طرف اس کو بگاڑنے اور اس میں بے حیائی وفحاشی پھیلانے کا بھی کام کرتا ہے۔ ادب کو محض لطف ولذت کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اور اصلاح وتربیت کے لیے بھی۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ ہر زمانے میں لوگوں نے اِس سے دونوں طرح کے کام لیے ہیں جس کے دور رس اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

ادب کی ایک بڑی خوبصورت اور دلکش صنف ''ملفوظات و مواعظ'' کی بھی ہے جس کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ اسلام میں اِن کا آغاز حدیث نبوی قولی سے سمجھا جاسکتا ہے جس کو بعض صحابۂ کرام نے انفرادی طور پر سپردِ قلم کرنے کی مقدور بھر کوشش کی تھی۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کا مرتب کردہ مجموعہ ''الصحیفة الصادقة'' ملفوظات ہی کی ایک اہم کڑی ہے۔ اِسی طرح اقوالِ ائمۂ حدیث وفقہ وتفسیر بھی ایک لحاظ سے ملفوظ ادب ہی کے دائرے میں آتے ہیں، صوفیہ کے سوانحِ حیات اور تذکروں میں اُن کے اثر انگیز ملفوظات بھی ملتے ہیں۔ اُردو زبان وادب کے ارتقاء کا نقطۂ آغاز ملفوظات ہی رہے ہیں۔ اُردو کے گیسو کو جتنا بزرگوں کے ملفوظات ومواعظ نے سنوارا ہے اُتنا کسی اور نے نہیں سنوارا۔ چنانچہ خواجہ معین الدین چشتی کے ملفوظات، حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کے ملفوظات، ملفوظاتِ مظہری، ملفوظاتِ نقشبندیہ، ملفوظاتِ قادریہ وغیرہ بے شمار کتابیں ہیں جو بزرگوں کے ملفوظات سے بھری پڑی ہیں۔ اور اخیر دور میں تو مولانا محمد الیاس صاحبؒ بانی تبلیغ کے ملفوظات، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ، حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب ہردوئی اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ملفوظات نے تو ہزاروں کی زندگیاں بدل دی ہیں۔

اسی سلسلۃ الذھب کی ایک اہم کڑی ہمارے ممدوح اور سیمینار کا موضوع حضرت مولانا شاہ محمد عبد الرحیم نقشبندی مجددی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات ومواعظ بھی ہیں۔ بزرگوں کے ملفوظات چونکہ قرآن وحدیث ہی سے ماخوذ ہوتے ہیں لہٰذا اُن میں بے پناہ طاقت وتاثیر ہوتی ہے اور وہ دلوں کو تسخیر کرنے کا کام کرتے ہیں اور کیوں نہ ہو جب کہ:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

حضرات! وقت کی تنگ دامانی اور اس عاجز و کوتاہ قلم کی بے بضاعتی درازنفسی کی اجازت بالکل نہیں دیتی اس لیے میں حضرت مولانا شاہ محمد عبدالرحیم نقشبندی مجددی رحمۃ اللہ علیہ کے چیدہ چیدہ چند ملفوظات ہی پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ دین یا دنیا سے متعلق کسی بھی گفتگو کے موقع پر حضرت مجددی صاحب کی باتیں ایسے پر حکمت انداز میں ہوتی تھیں کہ براہِ راست مخاطب کے دل و دماغ میں اتر جاتی تھیں اور اُس کے دل میں اس بات کا داعیہ وجذبہ پیدا ہوجاتا تھا کہ اصلاحِ نفس کی فکر اور باطنی ترقی اور یقینِ آخرت کے ساتھ دیدارِ الٰہی کا اشتیاق کیسے پروان چڑھے؟ آپ کی پُر حکمت باتوں اور ملفوظات کے انمول موتیوں میں سے چند یہاں بطور نمونے کے ہدیۂ سامعین ہیں۔

آہنگ میں یکتا صفت سورۂ رحمٰن

حضرت مولانا شاہ محمد عبدالرحیم نقشبندی مجددیؒ نے ایک موقع پر سورۂ رحمٰن کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ سورہ رحمن کی کی ہر آیت کا بیان وصفت جدا جدا ہے مگر ہر ایک آیت کی غرض اور مقصد ایک ہی بات کا اثبات ہے کہ تم اللہ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

ایک موقع پر علم کی اہمیت وضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت مجددی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فارسی کا مندرجہ ذیل مشہور شعر پڑھا اور پھر اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

پئے علم چوں شمع باید گداخت
کہ بے علم نتواں خدارا شناخت

یعنی حصول علم کے لیے اپنی ذات کو شمع کی مانند پگھلانا اور گھلانا چاہئے، اِس لیے کہ بے علم شخص اللہ کو نہیں پہچان سکتا۔

مزید فرمایا:

''اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی منشا کو سمجھنے کے لیے علم بہت ضروری ہے، اِس لیے علم حاصل کرو کیونکہ بیشک علم کی فضیلت اعلیٰ وارفع ہے اور علمِ شریعت ہی دین کی اصل بنیاد ہے''

مزید فرمایا:

'' طریقت وسلوک کے رموز واسرار اُسی پر منکشف ہوتے ہیں جو شریعت کا پابند ہو، اِس لیے کہ طریقت کی بنیاد شریعت ہی ہے۔ تقویٰ، پرہیزگاری، قرآن وحدیث اور سنت کی پیروی کے بغیر ایک قدم بھی آگے ترقی ممکن نہیں''۔

بصیرت و بصارت میں فرق

مشہور نعت گو شاعر اقبال عظیم کا ایک شعر ہے جس میں انھوں نے ایک ہی مصرعے میں بصارت اور بصیرت دونوں لفظ استعمال فرمائے ہیں، ملاحظہ ہو:

بصارت کھو گئی لیکن بصیرت تو سلامت ہے
مدینہ ہم نے دیکھا ہے مگر نادیدہ نادیدہ

حضرت مجددی صاحب نے ان دونوں کا فرق واضح کرتے ہوئے فرمایا:

'' تصوف کی اصطلاح میں بصیرت اور بصارت میں فرق ہے۔ بصارت ایک ظاہری قوت ہے۔ ظاہری آنکھوں سے دیکھنا بصارت کہلاتا ہے اور بصیرت دل کی آنکھوں سے دیکھنے کی وہ صلاحیت ہے جو نورِ حق سے روشنی حاصل کرتی ہے، جس سے اشیاء کی حقیقت اور باطنی کیفیت کا علم ہوتا ہے۔ چشمِ ظاہر کے بغیر قلب سے کسی چیز کی حقیقت کا ادراک بصیرت ہے۔ ذکرِ کثیر سے قوتِ بصیرت میں

اضافہ ہوتا ہے''۔

موت سے پہلے مرنا

ایک مرتبہ کسی نے پوچھا کہ حضرت ! (موتو ا قبل أن تموتوا) یعنی موت سے پہلے مرجاؤ کا کیا مطلب ہے؟۔فرمایا:

''نفسانی خواہش وجسمانی لذات کا ترک کرنا اور گناہوں سے خالص توبہ کرنا ہی مرنے سے پہلے مرنا ہے۔اِسے چار اصطلاحات سے سمجھا جاسکتا ہے:

اول: موتِ ابیض: یعنی بھوک، پیاس اور نیند پر قابو پالینا

دوم: موتِ احمر : یعنی خواہشات ولذات پو قابو پالینا تا کہ لذتوں کے قربان کرنے سے عزت حاصل ہو۔

سوم: موتِ اخضر : یعنی مستقبل کی آرزوؤں اور تمناؤں کو فنا کرنا اِس سے سالک سرسبز ہوتا ہے۔

چہارم: موتِ اسود : یعنی دونوں جہاں سے آنکھیں بند کرلینا یہی تصفیہ اور تزکیہ ہے۔''

والدین کی دعا کا مرتبہ

اسلامی شریعت میں والدین کا جو درجہ ہے اور اولاد کے حق میں اُن کی دعاؤں کا جو مقام ہے، اُس سے کس کو انکار ہے۔اِسی ضمن میں حضرت مجددی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اور کیا خوب فرمایا:

''لوگ ولی اللہ سے دعا کرانے کے لیے یہاں وہاں حیران و پریشان مارے مارے پھرتے ہیں حالاں کہ اُن کے پاس اِس بات کی کوئی کسوٹی نہیں ہوتی کہ وہ لوگ ولی اللہ ہیں بھی کہ نہیں اور اپنے گھر میں جو ولی اللہ ہوتے ہیں (یعنی ماں اور باپ) اُن سے دعا نہیں کراتے ہیں اور نہ اُن کی خدمت کر کے دعا لیتے ہیں۔جب کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ ماں باپ کی دعا اولاد کے حق میں اور نبی کی دعا اُمت کے حق میں رد نہیں ہوتی''۔

فضل الٰہی کو متوجہ کرنے کی شرطیں

ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

'' فضلِ الٰہی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے دو شرطیں ہیں: اخلاص اور استقامت ، جو اِن دو شرطوں کو پورا کرے گا ان شاء اللہ فضلِ الٰہی کے دروازے اُس پر کھل جائیں گے''۔

علماء کو کس طرح رہنا چاہئے

حضراتِ علماءِ کرام کے بود وباش ولباس اور رہن سہن سے متعلق حضرت مجددی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ملفوظ بھی آب زر سے لکھنے کے لائق ہے جس میں آپ نے فرمایا:

'' لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ پھٹے حال رہنا ہی علماء کا وطیرہ ہونا چاہیے، اُن کے نزدیک یہی سنت ہے۔بھلا اُنھیں یہ کون سمجھائے کہ اگر ایک طرف حضرت بلال اور حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہما کی پاک زندگی باعثِ رشک ہے، لائق اتباع ہے تو ساتھ ہی دوسری طرف حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی حیاتِ طیبہ بھی لائقِ افتخار ہے۔اور سرکار ذی وقار (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ صحابہ کرام گمراہی کے اندھیرے میں روشن ستارے ہیں، اُن میں کسی کی بھی اتباع کی جاسکتی ہے''۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر عمل قابل اتباع ہے

اتباعِ سنت کی اہمیت اُجاگر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا

کہ تمام نبیوں میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذاتِ گرامی کو ہی یہ فخر حاصل ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ہر ہر عملِ مبارک آج تک قابل تقلید ہے۔

طریقت بغیر شریعت کے نہیں ہے

حضرت نے فرمایا کہ فرائض کی ادائیگی میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔آپ فرماتے تھے کہ شریعت کے بغیر طریقت ممکن ہی نہیں ہے۔

دل آزاری گناہِ عظیم

فرمایا کہ شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ دل آزاری ہے چاہے وہ کسی کی بھی ہو۔

دنیا سے آنکھیں بند کرلینا اسلام کا طریقہ نہیں ہے

صحیح اسلام کا طریقہ بتاتے ہوئے آپ نے فرمایا: ''اسلام کا یہ قطعی منشا نہیں ہے کہ مذہب اور مذہبی زندگی کو شعار بنا کر دنیا سے آنکھیں بند کرلی جائیں۔معبد خانوں اور خانقاہوں میں اسیر و محصور ہوجائیں۔یہ انداز خلیفۃ اللہ فیالأرض بننے کی راہ سے فرار اور فرائضِ دنیا سے تھک جانے اور بیزاری کی دلیل ہے''۔

یاحی یاقیوم کی تشریح

حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ پونے کی جامع مسجد میں نمازِ اشراق کے بعد فرمایا کہ (الحی القیوم) کے مبارک اور پاک ناموں کی تجلیات جس بندۂ خاص کے قلب پر نازل ہوتی ہیں، اُس کے دم قدم سے نظام عالم کا تعلق ہوتا ہے اور وہی منصبِ ''ارشاد'' پر فائز ہوتا ہے لیکن یہ مقامِ بلند ذکرِ حق، فکرِ حق اور اتباعِ حبیب خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے کمال کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا''۔

سامعینِ کرام! یہ حضرت شاہ محمد عبدالرحیم صاحب نقشبندی مجددی رحمۃ اللہ علیہ کے چند چیدہ چیدہ ملفوظات ہیں جو بطور مشتے نمونہ از خروارے کے آپ کی خدمت میں حاضر کیے گیے۔اِن سے حضرت کے مقامِ بلند کا اندازہ بآسانی کیا جاسکتا ہے۔

آخر میں میں اپنی بات بانی رابطہ ادب اسلامی وصدرِ اول حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک اقتباس پر ختم کرتا ہوں جس میں حضرت نے ایک طاقت ور اور پُراثر علمی و ادبی اسلامی لٹریچر کی تیاری پر زور دیا ہے جو معاشرے کی برائیوں کا خاتمہ کر کے علم و ادب اور حسنِ اخلاق کی خوشبو بکھیرے اور جو ہمارے نزدیک اِس سیمینار کا پیغام بھی ہے۔حضرت مولانا فرماتے ہیں:

> ''اگر ہم نوجوانوں کی صحیح اور گہری اسلامی تربیت کرنا چاہتے ہیں تو اِس کے لیے ہم کو نئے علمی و ادبی اسلحے سے مسلح ہونا پڑے گا، تیاری کرنی ہوگی۔اُن تمام شرطوں کو پورا کرنا ہوگا جو ہر زمان و مکان کے لیے ہیں اور جو آج بھی اپنی قیمت، اہمیت اور اثر رکھتی ہیں یعنی ایک ایسا علمی اور اسلامی لٹریچر تیار کرنا ہوگا جو نوجوانوں کے ذہن سے قریب ہو، جو اُن کو اپیل کرے، جسے نوجوانوں میں مقبولیت حاصل ہو بلکہ وہ اُس کو پڑھنے کے لیے بے چین اور بے قرار ہوں۔اگر ہم نے یہ شرطیں پوری کرلیں تو مجھے یقین ہے کہ نوجوان صرف یہی نہیں کہ اِس نظریے پر ایمان لائیں گے بلکہ اُس کو عام کرنے کی ہر ممکن جدوجہد کریں گے اور اُس کے لیے جان کی بازی لگادینے سے دریغ نہ کریں گے''۔

(سہ ماہی کاروانِ ادب، لکھنؤ۔شمارہ اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۷)

آیا ہمارے دیش میں ایک خوشنوا فقیر
آیا اور اپنی دُھن میں غزل خواں گزر گیا

علامہ شبلی کا دعوتی اسلوب

عصرِ حاضر کے تناظر میں

مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی ندوی

علامہ شبلی نعمانیؒ کی علمی و دینی خدمات کے موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے کئی عجیب اتفاقات سامنے آتے ہیں، مثلاً وہ ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے اور ۵۷ سال کی عمر میں انتقال کر گیے، وہ ۱۸۵۷ء میں اس وقت دنیا میں آئے جب برصغیر میں مسلمانوں کی سیاسی زندگی نے ایک نیا رخ لیا۔ دوسری طرف علامہ شبلیؒ کی اس دنیا میں اسی سال آمد نے یہاں کی علمی و تحقیقی زندگی کو ایک نیا رخ دیا۔

ان کی علمی خدمات کے تین اہم اور ممتاز شعبے تھے جس میں وہ سب سے اونچی اور آخری سطح پر تھے اور وہ شعبے اردو ادب، تاریخ نویسی اور سیرت نگاری کے تھے۔ عالمی سطح پر اردو ادب کے چار اساطین مولانا حالیؔ، ڈپٹی نذیر احمد اور محمد حسین آزادؔ کے ادبی گروہ کے وہ سرخیل تھے۔ تاریخ نویسی کو انہوں نے ایک نیا رخ دیا اور علمی حلقوں میں اس کو اعتبار اور وزن سے ہمکنار کر دیا۔ اسی طرح سیرت نگاری کو انہوں نے مذہبی ضرورت سے زیادہ ایک علمی و تمدنی ضرورت بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا اور اس کا ایک کامیاب نمونہ خود سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شکل میں عالمِ انسانیت کے سامنے رکھا، اس میدان میں ان کو اردو ہی نہیں بلکہ تمام عالمی زبانوں میں انفرادیت حاصل ہوئی۔

عصرِ حاضر کے تناظر میں ان کے دعوتی اسلوب کا جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ اسلامی تاریخ کے پہلے مورخ تھے جنہوں نے خود جدید یورپی و مغربی اسلوب میں ان عیسائی مؤرخین اور مستشرقین کو منھ توڑ جواب دیا جنہوں نے ایک منصوبے کے تحت اسلامی تاریخ کو اس طرح مسخ کیا تھا کہ خود مسلم تعلیم یافتہ طبقوں اور نئی نسلوں کو اپنے مذہب و تاریخ سے متعلق احساسِ کمتری کا احساس ہونے لگا تھا۔ خود اپنے اسلاف سے ان کو نفرت پیدا ہو رہی تھی، مغرب کے مقابلے میں خود اپنے اسلامی کارنامے ان کو پھیکے نظر آنے لگے تھے اور خود اپنی تاریخ سے اس کو گھن محسوس ہونے لگی تھی لیکن علامہ شبلیؒ کے اس میدان میں کامیاب علمی اسلوب اختیار کرنے سے خود مسلمانوں کا سر فخر سے اونچا ہونے لگا اور ان میں اپنی سنہری تاریخ سے متعلق احساسِ تفاخر پیدا ہونے لگا، مثلاً جب یوروپین مؤرخ نے بہت زور سے اس بات کا پروپیگنڈہ کیا کہ حضرت عمرؓ نے اسکندریہ کے کتب خانوں کو جلا دیا تھا اور یہ مسلمانوں کی علم دشمنی کی دلیل تھی تو عالمی سطح پر علامہ شبلیؒ وہ پہلے مسلم مؤرخ تھے جنہوں نے پورے تاریخی دلائل کے ساتھ اس بات کو ثابت کیا کہ مسلمانوں کے متعلق ان کا یہ الزام غلط ہے بلکہ صدیوں پہلے اس کتب خانے کو خود عیسائی برباد کر چکے تھے اور اس کے برخلاف مسلم سلاطین نے ہمیشہ ہر خطے میں اس طرح کے کتب

خانوں کو خود بڑھ چڑھ کر قائم کیا۔ اسلامی حکومت میں جزیہ کو غیر مسلموں اور کافروں پر ظلم ثابت کرنے کے لیے یورپی مورخین نے انتھک کوشش کی لیکن علامہ شبلی وہ مؤرخ تھے جنہوں نے تاریخی حوالوں سے اس بات کو ظاہر کیا کہ یہ ان کے کفر کی وجہ سے اسلامی سلطنت میں لیا جانے والا ٹیکس نہیں تھا بلکہ اسلامی فوجوں کے ساتھ ان کے شریکِ جنگ نہ ہونے کا معاوضہ تھا، اس لیے کہ خلفائے راشدین کے زمانے میں شریکِ جہاد ذمیوں کو ہمیشہ جزیہ سے مستثنیٰ رکھا گیا تھا، اس طرح اس الزام کی تردید ہوئی کہ اسلام اپنی سلطنت میں کسی غیر مذہب والے کو برداشت نہیں کرتا۔

اسی طرح ان کا ایک اہم کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے عالمی سطح پر سیرت نگاری میں سب سے پہلے جرح وتعدیل اور اصولِ روایت کا پاس ولحاظ رکھا اور اس کو رطب ویابس اور غیر مستند روایتوں سے پاک کیا، ورنہ اس سے پہلے سیرت نگاری صرف واقعہ نگاری اور تاریخ نویسی تک محدود تھی اور میلادی جلسوں میں سیرت کی کتابوں کو تلاوت کی طرح صرف برکت کے لیے پڑھا جاتا تھا، اس طرز سے انہوں نے یہ ثابت کیا کہ ایمان واسلام صرف توحید کے قائل ہونے کا نام نہیں بلکہ وہ اقرارِ نبوت کے بغیر نامکمل ہے، اس لیے حاملِ وحی، سید الخلائق کی مکمل وصاف ستھری سیرت وسوانح بھی ایک انسانی ضرورت ہے نہ کہ صرف مذہبی۔

اپنے معاصر علماء میں ان کی سب سے بڑی امتیازی شان یہ تھی کہ انہوں نے تحریکِ ندوۃ العلماء میں حصہ لیکر علماء کی ایک ایسی جماعت تیار کی جو دعوتی میدان میں ہر طرح کے علمی ہتھیار سے لیس ہو کر مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کو مسکت جواب دے سکے اور اسلام کے تہذیبی وعلمی تفوق کو ثابت کرتے ہوئے خود ان کے معائب وعلمی خامیوں اور تمدنی تضاد بیانیوں کی نشاندہی کر سکے تاکہ اسلام کی تاریخی عظمت دنیا کے سامنے آسکے۔ برصغیر میں خود انہوں نے پہلی دفعہ یورپ کے مؤرخین ومستشرقین کا تنقیدی تعاقب کیا، ان کے حوالوں کا تجزیہ کیا اور ان کی غلطیاں گنائیں، وہ تاریخ نویسی میں اگرچہ جدت پسند تھے لیکن ان کا یہ کمال تھا کہ انہوں نے ماضی سے اپنے رشتے کو منقطع ہونے نہیں دیا، خود ان کا کہنا تھا کہ جب تک ہمارے علماء جدید فلسفہ اور جدید علوم کو بذاتِ خود حاصل نہیں کریں گے ان کے لیے ناممکن ہے کہ وہ ان اعتراضات کا جواب دے سکیں جو یورپ کے ملحدین اسلام پر کرتے ہیں اور جن کا اثر ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقے پر ہوتا ہے، بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ وہ پہلے مؤرخ تھے جنہوں نے قدیم علمِ کلام میں جدید علمِ کلام کے عناصر جمع کیے۔

اسی طرح ان کا ایک اہم کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے قدیم یونانی کتابوں کو براہِ راست آنکھ بند کر کے درس میں داخل نہیں کیا بلکہ ان علوم کو خود پہلے مسلمان بنایا اور پھر ان کو مسلمانوں میں رواج دیا۔ اسی طرح ندوۃ العلماء کے ذریعے انہوں نے برِصغیر کے دینی طبقے وعلماء میں موجود جمود کو ختم کیا ورنہ ہمارے علماء بالعموم درسیات یا پھر تصنیفی میدان میں فقہ وتصوف اور اختلافی مسائل پر تحقیق تک محدود تھے، پہلی دفعہ انہوں نے ان کے تصنیفی دائرے کو مسلمانوں کی لسانی، تہذیبی وتمدنی، تاریخی وعلمی اور سماجی وسیاسی میدانوں تک وسیع کر دیا، ندوۃ العلماء اور دارالمصنفین سے شائع کتابیں اس کی شاہد ہیں، عجمی ممالک میں مناظرہ کو سب سے پہلے انہوں نے ہی ایک نیا رخ دیا، دوسرے الفاظ میں اس کی بگڑی شکل کو بدل دیا اور حق کو ثابت کرنے کے لیے (باقی صفحہ نمبر ۶۶ پر)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی

شگفتہ مزاجی

جناب محمد یٰسین ذکی (بجنور)

شگفتہ مزاجی ایک لطیف اور پاکیزہ صفت ہے۔ یہ شخصیت کو باکمال اور خوش خصال بنادیتی ہے۔ شگفتہ مزاجی بادِ نسیم کا ایک جھونکا ہے جو تازگی وفرحت کا باعث ہوتا ہے۔ ایک ایسی خوشبو ہے جس سے شبنمی گفتار جنم لیتی ہے اور مرجھائے دل باغ باغ ہوجاتے ہیں۔ شگفتہ مزاجی سے دلوں کے بوجھ اتر جاتے ہیں، مایوسیاں کافور ہوجاتی ہیں، مشکلیں اور پریشانیاں چھٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں، ہم سفر نئے عزم وحوصلہ کے ساتھ رواں دواں ہوجاتے ہیں اور نئے نئے افراد قافلۂ انسانیت کا حصہ بننے لگتے ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ صالحین، صدیقین، حکماء، اولیاء، صحابۂ کرامؓ اور انبیاء کرامؑ نے بھی تبسم آفریں شگوفہ ہائے تکلم سے ماحول کو خوشگوار بنایا ہے، بہت خاموشی اور آہستگی کے ساتھ دلوں کے در کھول کر آسودگی بخش روشنی عطا کی ہے۔ چمن زار تخلیق میں شگفتن گلہائے ناز کے اسی مبارک روشنی کے قیمتی لمحات ہوں گے جب حضرت علامہ سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے سچے جانشین اور خلیفہ مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ نے تکیہ کلاں رائے بریلی کی پرنور فضا میں پہلی سانس لی ہوگی۔ حضرت مولاناؒ کی شخصیت کا ارتقاء اس روحانی ماحول میں ہوا جہاں اخلاق وکردار کی بلندی، شرافت نفسی، نرم روی، شبنم مزاجی اور نوعِ انسانی کے لیے دردمندی وشگفتگی اصل پہچان تھی۔

اس لیے حضرت کی شخصیت کمال شعور اور شدتِ احساس کے باوجود زندگی کی وادئ کرب والم سے گزرنے والی ایک موجِ نور ونکہت بن گئی جو موتی اور پھول برساتی ہوئی گزر گئی اور زمانے کے لیے صبح کی وہ پہلی کرن کی مانند ثابت ہوئی جو سبک انداز میں خواب گاہ کے کسی دریچہ سے ایک مہین روشنی بکھیر دیتی ہے جس میں نہ چبھن ہوتی ہے اور نہ تپش بلکہ سرور وانبساط کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔

حضرت مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم نے ماہنامہ ''پیامِ عرفات'' کے اداریہ میں حضرت مولاناؒ کے بارے میں کیا خوب تحریر فرمایا ہے:

''ان کا فیض عام تھا، اس میں خاص وعام کی کوئی قید نہ تھی، کوئی بڑا ہو، یا چھوٹا، کسی ادارہ کا سربراہ ہو یا ایک عام مسلمان ان کا در سب کے لیے یکساں کھلا تھا، ایک معمولی بے ہنگم نوجوان ہو، کوئی معمولی طالب علم ہو، ہر ایک کو اس در سے سودا ملتا تھا اور سب اپنی تشنگی وہاں آکر دور کرتے تھے، سب کو اپنے درد کا درماں حاصل ہوتا تھا۔''

حضرت مولاناؒ کی مجلس کوئی ایسی مجلس نہ تھی جہاں قہقہے لگتے ہوں بے فکری کے ساتھ ہنسا جاتا ہو۔ لیکن آپ کی مجلس کبھی کسی پر گراں نہ گزرتی، حاضرین سنجیدگی کے بوجھ سے کبھی منھ نہ بسورتے،

اس لیے کہ آپ کا شبنمی مزاج مسکراتا چہرہ، تبسم لبریز لطیف باتیں، تسلی آمیز کلمات، تسکین بخش دل کو چھو لینے والا انداز، ہر ایک کو اپنے قریب محسوس ہوتا ہوا طرز تخاطب دل میں اتر جاتا، ساتھیوں کے دلوں سے غم اور مایوسی کا دباؤ ہٹ جاتا اور حضرت بہت آہستگی اور خاموشی سے لوگوں کے عالم باطن میں داخل ہوجاتے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کا عکس تھا جس کے بارے میں راوی بیان کرتا ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہمیشہ ایک مسکراہٹ طاری رہتی اور چہرۂ انور ہمیشہ دمکتا رہتا۔''

حضرت مولاناؒ کے تبسم آفریں اور شگفتہ مزاجی کے واقعات جابجا بکھرے ہوئے ہیں جن کی زبان حال سے گردوپیش گواہی دے رہا ہے۔ میں نے انداز گل چینی سے ان کو جمع کرنے کی جسارت کی ہے۔

واقعات:

(۱) حضرت مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی (عم محترم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ) مضمون میں بیان فرماتے ہیں:

''ایک واقعہ ان کی خدمت میں پیش پیش رہنے والے بھائی مصباح الدین نے بیان کیا کہ ایک صاحب بڑی عمدہ کھجور لائے اور وہ کھجور مولانا نے کسی کو ہدیہ کردیں، بھائی مصباح الدین کو جب یہ پتہ چلا تو انھوں نے مولانا سے کہا فلاں صاحب آپ کے لیے کھجور لائے تھے اور آپ نے وہ کسی کو دے دیں، مولانا اس پر یہ کہہ سکتے تھے کہ تم کو کیا مطلب، جس کو چاہوں دوں لیکن مولانا نے اس کے جواب میں بڑی نرمی سے کہا: ''ارے چھوڑو اب تو دے دیں۔''

(۲) حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، مسلم پرسنل بورڈ کے نظم وانصرام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ایک صاحب جو خطابت کے میدان میں بہت مقبول تھے ان ہی کے کمرہ میں، میں نے دو اصحاب علم کو بھی رکھا جو علی گڑھ سے تھے۔ مولانا نے ان حضرات کے بارے میں فرمایا ''یہ اصحابِ علم اور سنجیدہ لوگ ہیں اور مسکرا کر فرمایا کہ اُن دونوں کو ان صاحب کے ساتھ نہ رکھیے۔''

(۳) محترم ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی صاحب ''لا مجھ کو دکھا ان کی طرح کوئی اگر ہے'' کے تحت رقم طراز ہیں کہ ''ایک موقع کی خوشگوار ملاقات اب تک یاد ہے، مولانا تقی الدین ندوی حفظہ اللہ کے مدرسہ جامعہ اسلامیہ اعظم گڑھ میں ایک سمینار تھا، افتتاحی اجلاس کے بعد مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ استاذ محترم مولانا سید محمد واضح رشید ندویؒ بھی موجود تھے۔ مولانا رابع صاحبؒ نے فرمایا: ''رضی الاسلام تو اپنے آدمی تھے'' مولانا واضح صاحب نے معمولی ترمیم کے ساتھ جملہ دہرایا ''رضی الاسلام اپنے آدمی ہیں۔''

(۴) مولانا ممشاد علی قاسمی صاحب بانی جامعہ فلاح دارین بلاس پور اپنے مضمون ''اب یاد نہ آؤ رہنے دو'' میں بیان کرتے ہیں کہ ''عشاء بعد مجلس میں بہت پر لطف باتیں ہوئیں۔ حرمین شریفین اور وہاں کے قدیم وموجودہ حالات کا ذکر چل رہا تھا۔ اس پر حضرت مولانا نے فرمایا کہ اب تو لوگ ملازمت کے سلسلہ میں بہت جارہے ہیں اور وہاں رہ کر عام آدمی بھی وہاں کی عام زبان اور اصطلاحات سیکھ لیتا ہے۔ پہلے زیادہ تر لوگ صرف حج وعمرہ کے لیے جاتے تھے۔ اس لیے اس مختصر قیام میں زبان واصطلاح سے واقف نہیں ہو پاتے تھے۔ پھر فرمایا کہ عربوں کی عادت ہے کہ اگر آپس میں کوئی جھگڑا یا سخت کلامی ہوجائے تو سامنے والے کو ذرا ٹھنڈا کرنے

کے لیے کہتے ہیں ''صل علی النبی'' (نبیؐ پر درود بھیجو) کسی عرب کا ایک ہندوستانی سے جھگڑا ہوگیا۔ ہندوستانی بہت غصہ میں تھا۔ اسی دوران عربی نے کہا ''یا أخي! صلّ علی النبي'' ہندوستانی چوں کہ اس بات کو سمجھتا نہیں تھا۔ اس نے یہ سمجھا کہ عربی مجھے کوئی سخت بات کہہ رہا ہے۔ اس لیے اس نے غصہ میں فوراً جواب دیا۔ تجھ پر ''صل علی النبی'' یہ واقعہ سنا کر حضرت خود بھی ہنسے اور حاضرین بھی ہنسنے لگے۔

(۵) مولانا شیخ ابرار احمد ندوی صاحب استاذ ندوۃ العلماء نے ''حسن اخلاق کا حسین پیکر'' مضمون میں لکھا ہے کہ ''کانپور سے ایک صاحب تشریف لائے۔ ان کے حلیہ ولباس سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی شریف خاندان سے تعلق ہے لیکن وہ مایوس اور پریشان تھے، مہمان خانہ کے پاس ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ حضرت سے ملنا چاہتا ہوں، میرا بھائی P.G.I اسپتال میں داخل ہے۔ موذی مرض میں مبتلا ہے، اس کا آپریشن ہونا ہے۔ مصارف کا معقول نظم نہیں۔ انھوں نے ایک مسلم وزیر کا نام لیا۔ ان کے نام سفارشی تحریر چاہتا ہوں۔ بہرحال حضرت مولانا سے ان کی ملاقات ہوئی۔ حضرت مولانا ان سے حسب عادت خندہ پیشانی سے ملے۔ میں یہ منظر دور سے دیکھ رہا تھا۔ کیا گفتگو ہوئی مجھے معلوم نہیں، البتہ جب یہ صاحب ملاقات کے بعد واپس آئے تو مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ حضرت مولانا سفارشی تحریر دیں یا نہ دیں۔ حضرت کی مسکراہٹ اور محبت کے ساتھ ملنے سے میرا آدھا غم دور ہوگیا۔

(۶) مولانا سعود الحسن ندوی صاحب (مدرسہ دینیہ غازی پور) اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ''تقریباً بیس سال پرانا واقعہ ہے۔ ایک بار باریابی ہوئی۔ تحفہ پیش کرتے ہوئے میں یہ بھی عرض کر گیا کہ حضرت اس کو استعمال کر لیجیے گا، خواہ ایک بار ہی سہی۔ صبح حاضری ہوئی تو نگاہ پڑتے ہی فرمایا ''صبح نماز سے پہلے ہی استعمال کر لیا گیا تھا بلکہ نماز بھی اس کے ساتھ ہی ادا کی۔''

(۷) مولانا شاہ اجمل فاروق ندوی صاحب نگراں I.O.S نئی دہلی نے ''۳/اپریل ۲۰۲۳ء کو ہم نے کیا کھویا'' کے تحت لکھا ہے کہ ''دہلی کے ایک سفر کا واقعہ ہے۔ ۲۰۰۹ء چل رہا تھا۔ ان دنوں ایک مشہور مسلم ماہر قانون نے مسلم پرسنل لا بورڈ کے خلاف محاذ کھول رکھا تھا۔ ان کی منفی تحریروں سے ملی فضا خاصی مکدر تھی۔ عصر بعد مجلس لگی ہوئی تھی۔ ان صاحب کا ذکر آیا تو ایک حاضر مجلس نے کہا ''حضرت ویسے انھیں بورڈ میں شامل کر لینا چاہیے۔'' مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا ''اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ایک شخص جو گھر کے باہر بیٹھ کر گالیاں دے رہا ہے اسے گھر کے اندر بلا لیا جائے کہ اب آپ یہاں بیٹھ کر گالیاں دیجیے۔''

(۸) مولانا عین الحسن ندوی صاحب، مہمان خانہ ندوۃ العلماء کا کہنا ہے کہ ''جب کوئی حضرت سے اصلاح کے لیے کہتا کہ حضرت میں اصلاح چاہتا ہوں تو فرماتے کہ میں بھی اپنی اصلاح چاہتا ہوں اور جب کوئی کہتا کہ حضرت ہم پر توجہ ڈال دیجیے تو فرماتے کہ ہم کو توجہ ڈالنا نہیں آتا۔ بہت ہی آسان انداز سے اس کی رہنمائی فرماتے اور وہ خوش ہو کر جاتا۔

حضرت مولاناؒ آج ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن آپ کی خوش طبعی اور لطافت گفتار کی مٹھاس ہمیشہ زندہ رہے گی، اور قافلۂ حق کے راہی جب تھکن محسوس کریں گے تو اس چاشنی سے نئی تازگی، نیا حوصلہ لے کر منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں ہوتے رہیں گے۔

پھول کی خوشبو ، ہوا کی چاپ ، شیشہ کی چمک
کون سی شے ہے جو تیری خوش بیانی میں نہیں

الوداع! اے میرے محبوب وطن

مولانا عبد الرحیم ندوی

آفتاب نصف النہار پر تھا، ہر طرف سناٹا، چلچلاتی دھوپ، چرند وپرند اپنے آشیانوں اور گھونسلوں میں، ہر طرف ہو کا عالم، آسمان اوپر سے انگارے برسا رہا تھا، زمین نیچے سے آگ اگل رہی تھی، باہر نکلیے تو منہ جھلسا جارہا تھا، یکا یک شاہ دو جہاں ابو بکر کے غریب خانے پر تشریف لاتے ہیں، دھوپ کی تمازت سے بچاؤ کے لیے چہرے پر کپڑا لپیٹ رکھا ہے۔ اللہ اللہ محبوب خود محب کے گھر آیا ہے، خوشی کا کیا عالم ہوگا؟ دونوں جہاں کا سردار پاؤں چل کر غلام کے پاس آتا ہے، دل کی دنیا کا کیا حال ہوا ہوگا؟

لیکن نہیں! آنے کو تو محبوب روز آتا ہے بلکہ ساتھ رہتا ہے، جب نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے تو ابو بکر کے دل کی دنیا میں ہوتا ہے، ذہن ودماغ میں تو ان کی تصویر نقش ہے، کب وہ ساتھ نہیں ہوتا؟

لیکن ایسی دوپہر میں کبھی نہیں آتا، آخر کیا وجہ ہے؟ خلاف معمول آنا یقیناً ایک محب اور جانثار کو بے چین کر دینے والی بات تھی، ابو بکر بے چین ہوئے، گھبرائے، اور تھوڑی ہی دیر میں نہ جانے ان کے دماغ میں کیا کیا خیالات آئے اور گئے، اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی اٹھ کر دروازہ کھولا حکم ہوا، رازدارانہ گفتگو کرنی ہے، لوگوں کو یہاں سے ہٹا دو، کون ہے آپ کے حرم سرا کے سوا سب محرم راز ہیں، ارشاد ہوا:

ہجرت کا حکم مل چکا ہے، فرطِ خوشی سے آنکھیں چمک اٹھیں، التجا کی، اے اللہ کے رسول! معیت کا شرف چاہتا ہوں، درخواست قبول ہوئی، بلکہ اسی دن کے لیے صدیق اکبر کو روکا ہی گیا تھا، خود آپ بھی اذن الٰہی کے منتظر تھے، آج انتظار کی گھڑی پوری ہو رہی تھی۔

رات نے اپنی سیاہ چادر تن دی تھی، ہر طرف سے سائیں سائیں کی آوازیں آنے لگیں، چلت پھرت بند، پورا مکہ نیند کی آغوش میں آرام کر رہا ہے، لیکن امت کا ہادی، امت کا درد رکھنے والا لوگوں کی امانتیں واپس کرنے کا انتظام کر رہا ہے، اپنے چچازاد بھائی علیؓ کو اپنے بستر پر سلاتا ہے اور جانتا ہے کہ آج کی رات دشمن میرے قتل کو آئیں گے لیکن اللہ کا رسول ہے، اللہ کے وعدے پر یقین ہے، ایسا یقین جو ہم اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ کر نہیں کر سکتے۔

رات ڈھلنے لگی، اندھیرا بڑھتا گیا، خون کے پیاسے نوجوانوں کی ایک جماعت آپ کے دروازے پر آکھڑی ہے، ہر ایک کے ہاتھ میں شمشیر بے نیام ہے، لیکن انتظار ہے کہ محمد گھر سے نکلیں اور ساری تلواریں یکبارگی ان کا صفایا کر دیں، ابلیس خوش ہے کہ آج شمع توحید ہمیشہ کے لیے بجھادی جائے گی، لیکن اللہ جس کو رکھے اس کو کون چکھے، کفر کی اس حرکت پر توحید خندہ زن ہے یہ احمق اس ماہ تمام کو پھونکوں سے بجھانے آئے ہیں، آفتاب کی کرنوں کو یہ بے نور کرنے کے دعویدار ہیں جس کے قتل کے لیے نوجوانوں کا پورا جتھا اکٹھا ہے وہ تن تنہا انہی کے سامنے سے گزرتا ہے، ان کے سروں پر خاک ڈالتا ہوا گزرتا ہے، لیکن جس طرح ان کے عقل پر پردہ پڑا تھا آج ان کی نگاہوں پر بھی پردہ ڈال دیا گیا، ان کو کچھ نظر آرہا ہے

نہ آہٹ محسوس ہورہی ہے، گویا خورشید تاباں کی شعاعوں نے ان کی نگاہوں کو ایسا چکا چوند کیا کہ بینائی ہی جاتی رہی الغرض یہ توحید کا متوالا بڑے اطمینان سے نکلتا ہے، ابوبکر صدیق کے گھر پہنچتا ہے، اور وہاں سے پروگرام کے مطابق اونٹنیوں پر سوار ہوکر جو میسر آیا توشۂ راہ لے کر نکل کھڑا ہوا۔

وہ بھی تو بشر تھا، اس کو بھی تو اپنے وطن سے محبت تھی، چرند و پرند کو اپنے ٹھکانوں اور گھونسلوں سے محبت ہوتی ہے، وہ تو افضل البشر تھا، مکہ اس کے دادا بابا کا مسکن تھا، اس نے مکہ کے اندر زندگی کی پچاس بہاریں گزاری ہیں، نہ جانے کیا کیا یادیں وہاں سے وابستہ ہیں، قلب پر رقت طاری ہوئی، جذبات کا تلاطم اٹھا، آنکھیں نم ہوگئیں، کعبہ کی در و دیوار پر رات کی تاریکی میں حسرت بھری نگاہ ڈالی، دل میں کیا کیا جذبات تھے، دماغ میں کیا کیا خیالات، اس کو کون جانے؟ کون دلوں کے حال سے واقف ہے؟ سوائے اللہ کے، لیکن زبان سے جو الفاظ ادا ہوئے اس میں سے تاریخ نے اپنے سینہ میں جو محفوظ کرلیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے فرمایا:

مکہ! تو مجھ کو تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے، لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے آہ! کیسے کور باطن تھے لوگ جو ان کی بھلائی کے لیے جان دے دے رہا تھا وہ اس کی جان لینے کے درپے تھے، جو ان کے لیے ہمیشہ ہمیش کی زندگی میں آرام و راحت کا گھر بنا رہا تھا وہ اسی کو بے گھر کر رہے تھے۔

آبدیدہ نگاہوں سے مکہ کو الوداع کہا اور دو نفری قافلہ ایک رہبر کی رہنمائی میں آگے بڑھا، ابھی تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ جبل ثور آگیا، خیال ہوا کہ سفر جاری رکھنا مصلحت کے خلاف ہے، دشمن صبح کو ہمیں نہ پاکر تلاش میں ضرور نکلیں گے اور راستہ میں پالیں گے، اس لیے ابھی کہیں چھپ جانا چاہیے، چنانچہ اسی پہاڑی میں ایک غار تلاش کیا محبوب اور محب کے قدم غار کی طرف بڑھے، لیکن محبت کی کرشمہ سازی دیکھیے کہ ابوبکرؓ کو کسی پل چین نہیں، دوڑ کر آگے چلتے ہیں، پھر نہ جانے کیا یاد کر لیتے ہیں اور پیچھے چلنے لگتے ہیں، لیکن یہاں بھی تو چین نہیں، نہ جانے ذہن میں کون سا انجانا خدشہ ابھرتا ہے اور دوڑ کر سرکار کے آگے ہو لیتے ہیں، ابوبکرؓ کیا بات ہے کبھی آگے چلتے ہو اور کبھی پیچھے، میرے محبوب جب تعاقب کا خیال دامن گیر ہوتا ہے تب پیچھے چلتا ہوں اور جب گھات کا اندیشہ ہوتا ہے تو آگے چلتا ہوں، اللہ اللہ یہ عشق، یہ فدائیت کہ اپنی جان جائے لیکن محبوب پر آنچ نہ آئے، دشمن کا وار ہو تو گردن میری آگے رہے، محبوب پر کوئی زد نہ پڑے۔

اس وارفتگی کے ساتھ حضور پر جاں نثار کرتے ہوئے غار تک پہنچے، حضور کو باہر ٹھہرایا، خود اندر گئے، اس کے ایک ایک روزن اور سوراخ کو بند کیا، اطمینان کر لینے کے بعد حضور کو بلایا۔

اے غار ثور! تو کتنا خوش نصیب ہے، تیری قسمت چمک اٹھی، شاہ بحر و بر کے قدم تیرے سینہ پر پڑے، تو بھی ان کا رازدار ہے، تیری خاک سرمہ بنانے کے قابل ہے، تو ہر صاحب ایمان کے لیے قابل رشک ہے، تیرا نام بھی جاوداں ہوگیا، تو بھی مرجع خلائق بن گیا، تیرا دیدار بھی باعث برکت ہوگیا، رہتی دنیا تک تیرا نام باقی رہے گا۔

تین دن اس غار میں رہے، کھانے کے لیے اسماء بنت ابوبکرؓ نے جو توشہ دیا تھا، اور مزید ابوبکرؓ کا غلام بکریاں چرا کر شام کو یہاں پہنچا دیتا، اس طرح ان کا گزر ہو رہا ہے، اور قریش مکہ کی سازشوں کی خبر رسانی کے لیے ابوبکرؓ کے لڑکے عبداللہ مقرر ہیں، اس طرح تین دن رات گزر گئے۔

ادھر قریش کے شہ سوار تلاش میں پھر رہے ہیں کہ اگر مل جائیں تو زندہ یا مردہ حاضر کریں سردار قریش کے سامنے، اور مقررہ انعام یعنی سو اونٹ حاصل کریں، تلاش کرتے کرتے دشمن کے قدم اس

غار کے دہانہ تک پہنچ گئے، اب کیا ہوگا؟ صرف ایک نظر کی کمی ہے، اگر صرف نظر نیچے کردیں تو اللہ کے دونوں بندے پکڑ لیے جائیں۔

کیسی نازک گھڑی تھی، کیسا پریشان کن مرحلہ تھا، کیسا فیصلہ کن لمحہ تھا، کون انسان ہے جو ایسے موقع پر سہم نہ جائے، اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے نہ ہوجائیں، کون بہادر ہے جس کو ایسے وقت میں پسینہ نہ چھوٹ جائے، لیکن نہیں! جس کے دل میں ایمان کی طاقت اور یقین کی قوت ہے، جس کی نظر اس ذات پر ہے کائنات کا ذرہ ذرہ جس کا تابع فرمان، چاند وسورج جس کے آگے سجدہ ریز، دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت جس کے حکم کے سامنے کی، اس شخص پر لرزہ ہے نہ خوف، دل بیٹھتا ہے نہ پاؤں ڈگمگاتے ہیں، بڑے وثوق اور اعتماد سے کہتا ہے (لا تحزن إن اللّٰہ معا) (غم نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے) وہ اللہ جس نے ہجرت کی رات قریش کی آنکھوں پر پردہ ڈالا، جس نے اپنے محبوب کو ان کے سامنے سے گزارا، آج اس نے ظاہری انتظام یوں فرمایا کہ غار کے منہ پر مکڑی نے جالا، آناً فاناً دو کبوتر آئے اور انڈے دے دئے، کور باطن قریش کی ساری ذہانت دھری کی دھری رہ گئی اور الٹے پاؤں واپس ہوگئے۔

تین دن اس غار میں رکنے کے بعد جب اطمینان ہوگیا کہ تلاش کرنے والے مایوس ہوچکے ہوں گے اور اب تعاقب بند کردیا ہوگا تو آگے کی منزل طے کرنے کے لیے قدم باہر نکالا، لیکن اب بھی عام راستہ پر چلنا خطرے سے خالی نہیں، اس لیے حق وصداقت کا یہ قافلہ عامر بن فہیرہ اور عبداللہ بن اریقط کی رہنمائی میں ساحل کے راستہ پر گامزن ہوا لیکن حد کردی کفار نے، ظلم کی بھی کوئی انتہا ہے، ارے تم اس کی بات نہیں مانتے تو نہ مانو، لیکن دوسروں کو تو نہ روکو، اگر تم اس کی صداقت پر یقین کے باوجود اس کے پیغام کے حامی نہیں تو دوسروں کی حمایت تمہارے لیے سوہان روح کیوں بنی ہے، جاؤ تمہارے دیار کو بھی اس نے چھوڑ دیا، تمہارے کیوں؟ بلکہ اپنے آبائی وطن کو تمہاری چیرہ دستیوں سے عاجز آکر خیر آباد کہہ دیا، اب تم کو چین کیوں نہیں آتا؟ تمہارا کانٹا تو نکل گیا، اب تمہیں قرار کیوں نہیں آتا؟ کیسے تم اس کو یہ سوچ کر اپنا مشن جاری رکھنے دیتے کہ چلو اگر کامیاب ہوگیا تو ہمارا ہی نام ہوگا، ہمارے ہی خاندان کا ایک فرد ہے، لیکن تم نے تو ظلم کی حد کردی، آج جب وہ تم سے نظر بچا کر جارہا ہے تو تم اس کو پکڑنے کے لیے اتنا بڑا اشتہار دے رہے ہو کہ جو پکڑ کر لائے اس کو سو اونٹ دیے جائیں۔

سو اونٹ کا انعام سن کر عرب شہ سواروں کے منہ میں پانی آگیا، ہر ایک نے چاہا میں اس کا مستحق بنوں، انہیں کیا خبر کہ جس کی تلاش پر یہ انعام مقرر ہے اس کی گرد راہ بھی ہم نہیں پاسکیں گے، اس کے قریب جائیں گے تو جل جائیں گے، دور ہی سے ٹھوکر کھائیں گے اور زمین میں دھنس جائیں گے، لیکن مادیت کے پرستاروں نے گھوڑے دوڑائے، سرپٹ دوڑائے اور قریب جا پہنچے، سراقہ بن جعشم قریب پہنچا، لیکن ٹھوکر پر ٹھوکر کھائی، اس کا گھوڑا گھٹنوں دھنس گیا، تب جاکر اس کو یقین ہوا کہ ہم مغلوب ہیں، اور وہ غالب ہیں، ہم خاطی ہیں اور وہ راہ راست پر ہیں، اس نے جاں بخشش کی اپیل کی، رحمت دو عالم نے امان کا پروانہ دیا اور یہ مژدہ سنایا، سراقہ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہارے ہاتھ میں کسریٰ کے کنگن ہوں گے؟ اللہ اکبر! یہ کون سی نگاہ دور رس تھی کہ جو اپنی جان بچا کر اپنے گھر سے نکل رہا تھا، دشمن تعاقب میں تھے، جان کے لالے پڑے تھے، اس کی نگاہ قیصر وکسریٰ کے کنگن اپنے غلاموں کے ہاتھ میں دیکھ رہی تھی، شاید دنیا انکار کردیتی اور کسی مجنون کی بڑ سے زیادہ درجہ نہ دیتی، لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کردیا اور تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ ’’حضرت عمر کے دور میں سراقہ کے ہاتھ میں کسری کے

کنگن پہنائے گئے۔"

بہرحال سراقہ نے امن کا پروانہ لیا اور واپس ہوا، اور یہ قافلہ اپنی راہ پر گامزن رہا، یہ بابرکت قافلہ سراپہ خیر تھا، مجسم سعادت تھا، جہاں سے گزرا موسم خزاں رخصت ہوا، کلیاں مسکرانے لگیں، رحمت و برکت کی گھٹا چھا گئی، جس منزل پر اترا باد بہاری چلنے لگی، اس ماہ وانجم کا گزر جہاں سے ہوا وہاں روشنی کی کرن پھوٹ پڑی، لوگوں نے دامن مراد بھر بھر لیے، ام معبد کی بانجھ بکری کے دودھ سے خالی تھن، دودھ سے ایسے بھر آئے کہ سب سیراب ہوئے پھر بھی دودھ بھرا کا بھرا رہا، غرض قافلہ چلتا رہا، اور اب قریش کے تعاقب کا خطرہ ختم ہو اجا رہا تھا، مکہ دور ہو رہا تھا، یثرب قریب آ رہا تھا، یثرب کی وادیاں اور گھاٹیاں جھک جھک کر سلام عرض کر رہی تھیں، گویا بے جانوں کے منہ میں زبان آگئی تھی، کشاں کشاں مظلومیت کا یہ سفر تمام ہو رہا تھا، قبا قریب آ گیا، آپ نے وہاں چار دن یا پندرہ دن قیام فرمایا اور تاریخ اسلام کی پہلی مسجد کی بنیاد رکھی، حضور کے مقدس ہاتھ اس میں کام کر رہے تھے، اسی کے متعلق تو ارشاد ہے: "لمسجد أسس علی التقویٰ" کیا اس سے بہتر بھی کوئی تعمیر ہوسکتی ہے جس میں دونوں جہاں کے سردار گارا مٹی دے رہے ہوں۔

اے قبا! تو بھی بڑا خوش قسمت ہے، اور اے مسجد قبا! تیرا نصیبہ بھی بڑا اعالی ہے، تیرا مقام بلند، تیرا نام زندہ و پائندہ ہے، اب منزل بالکل قریب ہے، اہل یثرب کو خبر ہو چکی ہے کہ کوکبۂ نبی قبا سے چل چکا ہے، اب کوئی دم پہنچا چاہ رہا ہے، انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئی، دیدار کا وقت قریب ہے، اب اہل یثرب جی بھر کر اس کے جمال جہاں آرا سے فیضیاب ہوں گے، تمام یثرب سراپہ انتظار ہے، ذرہ ذرہ رقصاں ہے، بوٹا بوٹا شاداں و فرحاں ہے، سعادت مندی پاؤں چل کر ان کے پاس آ رہی ہے، سراج منیر ان کے گھر کو منور کرنے خود آ رہا ہے، دستور کے مطابق ہتھیار سے سج دھج کر پورا یثرب استقبال کے لیے امڈا پڑ رہا ہے، مرد، عورت، بچے، بوڑھے اور نوجوان کی کوئی تفریق نہیں، ہر ایک سچ مچ دیدہ و دل فرش راہ کئے ہوئے ہے، گھر گھر عید کی خوشی ہے، یثرب کے کھجوروں کے جھرمٹ خوشی کے ترانے گا رہے ہیں، طائر خوش الحان بھی نغمہ سنجی میں مست ہیں کہ آج دنیا کا سب سے بڑا انسان، خدا کا برگزیدہ اور نبیوں کا سردار آ رہا ہے اور وہ اس کے دیدار سے آنکھوں کو منور کر رہے ہیں، چھوٹی بچیاں اپنی خوشی کا اظہار اپنی بھولی بھولی پیاری پیاری آواز میں گیت گا گا کر کر رہی ہیں۔

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا مادعا للہ داع

ان کے شیریں نغموں نے اس کیفیت کو دوبالا کر دیا ہے، ان کے لہجہ میں مسرت، عقیدت، اور جوش ملا جلا ہے، وہ زمین پر گا رہی تھی اور آسمان پر فرشتے جھوم رہے تھے۔

الغرض یثرب نے دونوں جہاں کی دولت سے اپنے دامن کو بھر لیا، مکہ نے جس کو دھتکارا مدینہ نے اس کو گلے لگا لیا، مکہ جس سے بیزار تھا مدینہ کو اس کا سراپا انتظار تھا، مکہ نے اس کے پیام کو رد کیا مدینہ نے اس کے پیام کو سینہ سے لگایا، مکہ نے اس در یتیم کی ناقدری کی، مدینہ نے اسے آنکھوں میں جگہ دی، ایک طرف دشمنی تھی، عداوت تھی، دوسری طرف محبت تھی، عقیدت تھی، ان کی بدبختی اور اور کور باطنی کی کی بھی کوئی حد ہے گھر کی دولت اپنے ہاتھوں ضائع کردی، اور مدینہ کی خوش بختی اور نصیبہ وری کی بھی کوئی انتہا نہیں کہ گھر بیٹھے دونوں جہاں کی سعادت سمیٹ لی۔

این سعادت بزور بازو نیست

تانہ بخشد خدائے بخشندہ

مولانا الطاف حسین حالی - مسدس کے آئینہ میں

مولانا انیس احمد ندوی

مولانا الطاف حسین حالی کا نام آتے ہی ایک طرف پختہ کار شاعر اور نثر نگار کا چہرہ سامنے آتا ہے تو دوسری طرف ایک مصلح وواعظ کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے، وہ اعلیٰ پایہ کے نقاد، شاعر، ادیب سوانح نگار اور مورخ تھے ان کی معرکۃ الآراء کتاب مقدمہ شعروشاعری جو اصلاً ان کی کلیات کا مقدمہ ہے اردو میں نقدنویسی کی بنیاد سمجھی جاتی ہے۔

وہ ادب جس سے انسانی اخلاق واقدار کی خوبصورت تشکیل ہو بجا طور پر تعمیری ادب کہلانے کا مستحق ہے، دین اسلام فطری دین ہے، انسانی معاشرتی آداب کی رعایت کرتے ہوئے مؤثر اسلوب میں فطری جذبات واحساسات کی ترجمانی جس فن میں کی جائے وہ فن پارہ بجا طور پر اصلاحی وتعمیری ادب کہلانے کا مستحق ہے، اس زاویہ نگاہ سے جب شعراء وادباء کی کاوشوں کا جائزہ لیا جاتا ہے تو مفید اور غیر مفید ادب یا تعمیری اور غیر تعمیری ادب دونوں کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں لیکن تاریخ کے دربار میں شہرت عام اور بقائے دوام انہیں شعراء وادباء کو حاصل ہوئی جنھوں نے معاشرہ کی تشکیل میں تعمیری ادب سے کام لیا، زبان کو صرف بولنے کا ذریعہ نہیں بلکہ مفید کلام بولنے کے طاقتور وسیلہ کے طور پر استعمال کیا اور دنیا کو پرسکون و پرامن بنانے میں، حقوق کی پاسبانی میں اور خوبصورت معاشرہ کی حسین تصویر پیش کرنے میں اپنا شکوہ قلم استعمال کیا، ظاہر ہے جہاں زور ہو مگر انسانوں کو انسانوں سے ملانے کے لئے، جوڑنے کے لئے نہ کہ توڑنے کے لئے، محبت کے لئے نہ کہ نفرت کے لئے تعمیر وترقی کے لئے نہ کہ تنزل وانحطاط کے لئے، وہ ادب یقیناً تعمیری ادب کہلائے گا اور جو ادبی کاوش دنیا میں فتنہ وفساد پھیلانے کے لئے وجود میں آئے وہ بامقصد اور تعمیری ادب کے زمرہ سے خارج کئے جانے کا مستحق قرار پائے گا۔

مولانا الطاف حسین حالی کو سخن گوئی اور ادب وشاعری کے اصولوں پر پرکھنے میں ہم ان کو تعمیری ادب اور ادباء کے اس زمرہ میں اعلیٰ مقام پر فائز پاتے ہیں جنھوں نے ادب کے طاقتور وسیلہ کو قوم وملت کی صلاح وفلاح کے لئے استعمال کیا، ادب کو بامقصد بنایا اور تعمیری ادب کی دعوت دی، ادب میں سرایت کرنے والی رکاکت کو دور کرنے اور ادب برائے ادب کے نظریہ کے خلاف عملی اقدام کے ذریعہ پرزور آواز بلند کی، مدوجزر اسلام معروف بہ مسدس حالی اسی تعمیری ادب کا نہایت خوبصورت مرقع ہے، جس میں شعریت ہے اور موسیقیت بھی، حسن ادا ہے اور سادگی میں پرکاری بھی، سخن گوئی کا حسن ہے اور تصویر کشی کی رعنائی بھی نیز تاریخ کو شعر کے پیرایہ میں خوبصورتی کے ساتھ پرونے کا ہنر بھی، یعنی سادگی، تاثیر اور اصلیت جو حالی کے مطابق شعر گوئی کے جوہر اصلی ہیں نہایت حسین پیکر میں ان کے یہاں پائے جاتے ہیں۔

ان کی نظموں میں جس طویل نظم کو عام قبولیت اور شہرت جاودانی ملی و مدو جزر اسلام معروف بہ مسدس حالی ہے جو ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی، مسدس حالی کا مرکزی موضوع یہی ہے کہ ؎

کل کون تھے آج کیا ہوگئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

حالی نے سادگی اور سلامت لیکن پر جوش اور پر تاثیر لہجے میں کم از کم سو اشعار میں آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ وسلم کی ولادت، تعلیمات وسیرت پر نہایت خوبصورت اشعار پر مشتمل جو آپ ﷺ کی سیرت کا حسین گلدستہ پیش کیا ہے، ظاہر ہے یہ حسین مرقع شعری صنائع اور تشبیہات واستعارات کے بغیر ممکن نہیں تھا جس کو حالی نے نہایت چابکدستی سے استعمال کیا ہے ملاحظہ کیجئے

یکا یک ہوئی غیرت حق کو حرکت
بڑھا جانب بوقبیس ابر رحمت
ادا خاک بطحا نے کی وہ ودیعت
چلے آتے تھے جس کی دینے شہادت

....

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نوید مسیحا

سیرت طیبہ کو کتنے دلکش انداز میں پیش کیا ہے کہ پڑھتے ہی ذہن میں سما ہو جائے، دل میں بیٹھ جائے، سیرت رسول پاک کے ایک اہم پہلو کو کس سادگی سے شعر کے پیکر میں ڈھال دیا ہے، جو حقیقت میں ''وما أرسلناک إلا رحمۃ للعالمین'' کا خوبصورت ترجمہ بلکہ اس کا عکس جمیل ہے ؎

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

اسلام سے قبل جزیرۂ عرب کی جاہلی رسمیں، بری عادتیں، آپس کی لڑائیاں، تحقیر انسان اور مختلف سماجی برائیوں کو حالی نے بڑی سچائی سے پیش کیا ہے اور آپ ﷺ کی آمد سے دنیائے انسانیت میں کیسے کیسے حیرت انگیز انقلابات رونما ہوئے ان کی تصویر کشی ملاحظہ کیجئے ؎

مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حراء سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

آپ ﷺ نے توحید کا سبق جس طرح عربوں کو دیا اس کی دلکشی ملاحظہ کیجئے ؎

کہ ہے ذات واحد عبادت کے لائق
زبان اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرمان طاعت کے لائق
اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لو اس سے اپنی لگاؤ
جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ

وہ خانۂ کعبہ جہاں تین سو ساٹھ (۳۶۰) بت رکھے ہوئے تھے ہر قبیلہ کا اپنا ایک بت ہوتا تھا، جہاں لوگ بری حالت میں عام

مصیبتیں بن گئی تھی ان سب کی تصویر کشی نے مسدس کی تاثیر کو بہت بڑھا دیا۔تہذیب وتمدن سے نا آشنا تھے،شراب نوشی عام تھی۔

مسدس حالی اسلامی ادب بلکہ ایک پاکیزہ اسلامی معاشرہ کے تشکیلی عناصر کی مثالوں سے پُر ہے، جگہ جگہ قرآن وحدیث کا ترجمہ کے ساتھ عربی نیز اسلامی کہاوتوں اور امثال کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ اشعار کے پیکر میں ڈھال دیا گیا وہ بھی اس انداز سے کہ شعریت،نغمگی،تاثیراور سادگی کسی بھی طرح متاثر نہیں ہونے پائی ہے، حالی نے اپنے اس جداگانہ اسلوب شاعری سے اسلامی ادب کا ایک ایسا اعلیٰ نمونہ پیش کیا جس نے انھیں شعراء کی فہرست وتاریخ میں ایک منفرد مقام عطا کیا ہے۔

مذاہب کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے ماننے والوں نے اپنے مصلحوں اور عظیم شخصیتوں کی تعظیم وتکریم میں مبالغہ کرتے کرتے ان کی پوجا اور عبادت شروع کردی، مگر حضور ﷺ کے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو آپ کو جان ودل سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور انھیں اس کی تلقین بھی کی گئی تھی آپ نے ان کو عظمت واحترام،عظمت واحترام کی حدبندیاں سکھائیں۔

بنانا نہ تربت کو میری صنم تم
نہ کرنا مری قبر پر سر کو خم تم
مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی
کہ بندہ بھی ہوں اس کا اور ایلچی بھی

مولانا حالی نے قوم کا نقشہ تقریباً چوسٹھ بند یعنی دوسو اشعار میں کھینچا۔مسلمانوں کی ترقی، عظمت وشوکت علم وحکمت، اخلاق وکردار اسلامی اقدار، امن وآشتی اور دوسرے ادیان سے صلح وآشتی کی خوبیاں اور پھر جو قوم علم وحکمت کے لئے برپا کی گئی تھی، جس کے نبی پر سب سے پہلی وحی ''اِقرأ'' کی نازل ہوئی تھی وہ تعلیم سے بیگانہ کیسے ہوگئی، اس کے لیے مسلمانوں کو سستی،غفلت، لاپروائی، ناخواندگی سے نکال کر قوت اور عمل کا باز وعطا کرنا چاہتے ہیں، اسی لیے مسدس حالی مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان ہے اور دوبارہ انھیں راہِ عمل پر گامزن کرنے کی تدبیر وکوشش بھی۔

وہ ملت کہ گردوں پہ جس کا قدم تھا
ہراک گھونٹ پہ جس کا برپا علم تھا
وہ فرقہ جو آفاق میں محترم تھا
وہ امت لقب جس کا خیر الامم تھا
نشاں اس کا باقی ہے صرف اس قدر یاں
کہ گنتے ہیں اپنے کو ہم بھی مسلماں

ایک وقت تھا جب ساری دنیا ہمارے زیرنگیں تھی،علم کی ہر شاخ،حکمت،فلسفہ،ہیئت،نجوم،ریاضیات،طبیعیات،کیمیا سب میں مسلمان فائق ہی نہیں اس کے موجد اور اس کے فروغ دینے والے تھے،علم وحکمت پر مسلمانوں کا سکہ چلتا تھا،مولانا حالی کہتے ہیں۔

یہ تھا علم پر واں توجہ کا عالم
کہ ہو جیسے مجروح جویائے مرہم
کسی طرح پیاس ان کی ہوتی تھی کم
بجھاتا نہ پیاس ان کی باراں نہ شبنم
حریم خلافت میں اونٹوں پر لد کر
چلے آتے تھے مصر و یوناں کے دفتر
نوشتوں سے ہیں جن کے ایک مزین
کتب خانہ پیرس و روم و لندن

وہ ملت کہ گردوں کو جس کے وجود پر فخر و ناز تھا، دنیا کے

ہر گوشہ پر جس کا حشم و دبدبہ تھا اور اللہ کی طرف سے اسے خیر الامم کا لقب ملا تھا، آج اس کا وجود خطرہ میں ہے، فقر و فاقہ مفلسی داد بار اس کی نشانی بن چکی ہے، پسماندگی، ناخواندگی اور غفلت اس کا شعار ہے، مسلمانوں کے اندر سفلہ پن اس قدر ہے کہ وہ گھٹیا سے گھٹیا کاموں کے لئے تیار ہیں، ان کے چال چلن بگڑ چکے ہیں ایسی قعر مذلت میں وہ جا گرے ہیں کہ جو فخر آدمیت تھا وہ ذلت ورسوائی کا رمز بن چکا ہے اور اب تو قیر تو درکنار فطری نجابت و شرافت بھی جاتی رہی، مسلمانوں کی حالت بہائم سے بھی بدتر ہوگئی ہے، حالی نے چڑیوں سے مشابہت دے کر فرمایا کہ

چکور اور شہباز سب اوج پر ہیں
مگر ایک ہم ہیں کہ بے بال و پر ہیں

اگر کسی نے علم کے بحر ناپیدا کنار میں غوطہ لگانے کی کوشش بھی کی تو ایسی غفلت ولا پروائی ہے کہ نہ دین ہی ہاتھ میں رہا نہ دنیا، نہ وہ دینی امور پر تشفی بخش گفتگو کر سکتے ہیں نہ نبوت و رسالت پر اٹھنے والے اعتراضات کا جواب دے سکتے ہیں، نہ توحید پر پرمغز گفتگو کر سکتے ہیں، غرضیکہ اپنی بات ثابت کرنے کی ان میں کسی طرح کی صلاحیت نہیں۔ تا حالی فرماتے ہیں ؎

نہ حجت رسالت پہ لا سکتے ہیں وہ
نہ اسلام کا حق جتا سکتے ہیں وہ
نہ قرآں کی عظمت دکھا سکتے ہیں وہ
نہ حق کی حقیقت بتا سکتے ہیں وہ
دلیلیں ہیں سب آج بیکار ان کی
نہیں چلتی توپوں میں تلوار ان کی

عام انسانی بیماریاں جو ترقی کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہیں مسلمانوں میں پوری طرح پھیل چکی ہیں، غیبت، حسد جلن، بغض، عداوت و نفرت، بات بات پر قسمیں کھانا، اگر کسی کے پاس تھوڑی دولت آجاتی وہ دوسرے انسانوں کو انسان نہیں سمجھتا تھا، کبر و غرور ان کا شیوہ بن جاتا ہے، فرماتے ہیں ؎

مجالس میں غیبت کا زور اس قدر ہے
کہ آلودہ اس خون میں ہر بشر ہے
نہ بھائی کو بھائی سے درگذر ہے
نہ ملا کو صوفی کو اس سے حذر ہے
اگر نشہ مے ہو غیبت میں پنہاں
تو ہشیار پائے نہ کوئی مسلماں

....

جنہیں چار پیسے کا مقدور ہے یاں
سمجھتے نہیں ہیں وہ انسان کو انساں
موافق نہیں جن سے ایام دوراں
نہیں دیکھ سکتے کسی کو وہ شاداں
نشہ میں تکبر کے ہے چور کوئی
حسد کے مرض میں ہے رنجور کوئی

مولانا حالی نے چھوٹی چھوٹی بحروں میں سادگی کے ساتھ جو ابھی انسانی تعلیمات پیش کی ہیں وہ انسانی زندگی کی تعمیر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور وہ ضرب المثل کی حیثیت سے لوگوں میں معروف ہیں، حالی کہتے ہیں کہ اگر بھائی بھائی کا مددگار ہوتا تو اتنے برے دن مسلمانوں کے نہ آتے مسلمان فقیری میں بھی بادشاہی کرتے، اور تعاون کے اسی جذبہ کی وجہ سے ہم خیر الامم کی حیثیت سے ممتاز ہوتے اور اس لقب کے واقعی اہل رہتے، کہتے ہیں ہے ؎

اگر بھولتے ہم نہ قول پیمبر
کہ ہیں سب مسلمان باہم برابر
برادر ہے جب تک برادر کا یاور
معین اس کا ہے خود خداوند داور
تو آتی نہ پیڑے پر اپنی تباہی
فقیری میں بھی کرتے ہم بادشاہی

مولانا حالی نے آپ ﷺ کی تعلیمات کو کس مؤثر انداز میں پیش کیا کہ ۔

یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالق دوسرا کا
خلائق سے ہے جس کو رشتہ ولا کا

"ارحموا من فی الأرض یرحمکم من فی السماء" کا ایک عکس جمیل ۔

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

آج انسانوں نے اپنی آنکھوں پر تعصب کا چشمہ لگالیا، رنگ ونسل، مذہب کی بنیاد پر اچھا ہونے یا برے ہونے کا فیصلہ کیا جانے لگا، پڑوسی کو پڑوسی سے کوئی یارانہیں، آپسی الفت ویگانگی میں بدلتی جاری ہے، انسان انسان کے خون کا پیاسا ہوگیا ہے، فرماتے ہیں

ہمارا یہ حق تھا کہ سب یار ہوتے
مصیبت میں یاروں کے غمخوار ہوتے
سب اک اک کے باہم مددگار ہوتے
عزیزوں کے غم میں دل افگار ہوتے
جب الفت میں ہوتے ہوں ثابت قدم ہم
تو کہ سکتے اپنے کو خیرالامم ہم

حالی کی سادہ اور آسان زبان کی جادو بیانی نے قوم کا دل جیت لیا، خاص طور پر ان کی دلآویز شخصیت میں شاعرانہ اور انشا پردازی کی صلاحیتوں کے ساتھ قوم وملت کی ترقی کی فکر مندی ایک ایسا وصف ہے جو بہت کم ایک ساتھ جمع ہوتی ہے۔

نظم کی صفت زندگی کے حقائق اور چھوٹی بڑی سچائیوں کو پیش کرنے کا راست وسیلہ سے حالی اس طبقہ شعراء کے سرخیل ہیں جنھوں نے نظم کو بھاری بھرکم الفاظ، ابہام اور ایہام وغیرہ سے آزاد کرنے کی کوشش کی اور اس کے لئے ایک سادہ آسان مگر پرکشش طرز وضع کی۔ جناب اسلم پرویز صاحب ایک مقالہ میں لکھتے ہیں:

انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب اصلاحی تحریک کا دور شروع ہوا تو ادب اور خصوصاً شاعری میں بھی اصلاحی مقاصد کو سامنے رکھنے کی ضرورت پر زور دیا گیا چنانچہ زندگی کی جن سچائیوں کو براہ راست اظہار کی جو روایت نظیرا کبرآبادی کے ذریعہ قائم ہوچکی تھی اس کی توسیع اسماعیل میرٹھی آزاد اور حالی جسے شاعروں کے ذریعہ اس وقت ہوئی جب نظم میں زندگی کی سچائیوں کو براہِ راست اظہار کے ساتھ ساتھ پیغام رسانی اور اصلاح معاشرہ کے مقاصد کو بھی پیش نظر رکھا گیا۔

مولانا حالی جو اس روایت کے نہ صرف بانی تھے بلکہ امین وپاسبان بھی، پوری شدومد کے ساتھ اس کو آگے بڑھایا اور کئی نظمیں لکھیں برکھارت مناجات بیوہ، مناظرہ رحم وانصاف، نشاط امید، حب وطن وغیرہ انھیں معرکۃ الآراء نظموں میں سے ایک مدوجزر اسلام معروف بمسدس حالی بھی ہے مرزا اسداللہ خاں غالب نے

بالکل درست کہا ہے کہ ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے، نا انصافی ہوگی اگر مسدس پر اٹھنے والے اعتراضات کا ذکر نہ کیا جائے، ڈاکٹر سید تقی عابدی لکھتے ہیں: مسدس کے شائع ہونے پر ملک بھر میں موافقت اور مخالفت کی آوازیں بلند ہوئیں، حالی کے خلاف طرح طرح کے مضامین اور نظمیں شائع ہوئیں، مسدس کی زبان، شعری نکات، موضوع اور مطالب پر اعتراضات کئے گئے، مسدس کے جواب میں مسدس حالی، ڈفالی، نقالی، جعلی وغیرہ کئی نظمیں لکھی گئیں۔

حالی کے مسدس کی مخالفت مختلف اسلامی گروہوں کی جانب سے ہوئی اور حالی کو شبلی اور سرسید کے خیالات کا یہ پیرو قرار دیا گیا مگر حالی پر سرسید، شبلی، ڈپٹی نذیر احمد اور اقبال کی طرح کفر کا فتویٰ صادر نہیں ہوا جب کہ حالی اردو ادب کے منفرد شاعر ہیں جس نے سب سے زیادہ اور سب سے واضح اشعار تکفیر کے خلاف کہے ہیں۔

بقیہ: عصرِ حاضر کے تناظر میں علامہ شبلی کا دعوتی اسلوب

جلسوں کے انعقاد اور اس میں طول وطویل لاحاصل مناظروں کے بجائے ایک دل نشیں شکل دی، انھوں نے اس طرح کے الزام کا جواب دینے کے بجائے اپنے دعوں کو ایسے تحقیقی اور موثر انداز میں پیش کیا کہ سامنے والا خاموش ہوگیا اور اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا، الفاروق کے ذریعے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دفاع کیا اور شیعوں کو خاموش کیا، سیرت النعمان کے ذریعے حضرت امام ابو حنیفہؒ کا علمی تفوق ثابت کیا اور اہلِ حدیث علماء کی غلط فہمیاں دور کیں۔ اسی طرح علمِ کلام کے ذریعے عیسائی مورخین اور مستشرقین کا منھ توڑ علمی جواب دیا۔

غرض یہ کہ علامہ شبلیؒ نے اپنی مختصر ۵۷ سالہ زندگی میں اسلام کی علمی وتحقیقی خدمت کے ذریعے سے یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی کہ مثبت علمی وتحقیقی اسلوب کے ذریعے اسلام کے تفوق وبرتری کو ثابت کرنے کی کوشش نہ صرف دیرپا ومستحکم ہوتی ہے بلکہ اسلام دشمن طاقتوں کا اس سے بہتر انداز میں جواب ہی نہیں دیا جا سکتا۔

اس طرح اللہ تعالی نے علامہ شبلیؒ کی شکل میں ملتِ اسلامیہ کو وہ عظیم تحفہ دیا تھا جس پر مسلمانانِ برِصغیر صدیوں تک فخر کرتے ہوئے اپنا سر اونچا کرسکیں گے اور عالم اسلام کا کوئی دوسرا خطہ بڑی مشکل سے اس کی نظیر پیش کر سکے گا۔

❁❁❁

تیرا ھی کرم

منشی گرونرائن لطفؔ

دریا میں روانی بھی تیرے ہی کرم سے ہے
ہر صبح سہانی بھی تیرے ہی کرم سے ہے

میں شکر کروں تیرا ہر سانس میں اے مولا
یہ میری جوانی بھی تیرے ہی کرم سے ہے

میں نام ترا لے کر کرتا ہوں مجلّا دل
آنکھوں میں جو پانی ہے تیرے ہی کرم سے ہے

❁❁❁

اہل دل کا کلام

محمد وثیق ندوی

اہل دل کے بیانات ومواعظ اور مکاتیب زورِقلم، قوت بیانی اور حسن انشاء کا بھی اعلیٰ نمونہ ہیں اور ان کے بہت سے ٹکڑے اس قابل ہیں کہ دنیا کے بہترین ادبی نمونوں میں شامل اور ''ادب عالی'' میں شمار کیے جائیں۔ دنیا کی اکثر زبانوں اور علم وادب کے بارے میں یہ زیادتی کی گئی ہے کہ صرف ان شخصیتوں کو ادیب، صاحب اسلوب اور انشاء پرداز تسلیم کیا گیا ہے اور انہی کی تحریر اور نتائج فکر کو ادب کے نمونہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، جنہوں نے ادب وانشاء کو ایک پیشہ، یا ذریعۂ اظہارِکمال کے طور پر انتخاب کیا، یا جو قدیم زمانہ میں امراء، حکام کے دربار سے متعلق تھے، اور کوئی تحریری خدمت ان کے سپرد تھی، یا جنہوں نے انشاء میں صناعی اور تکلف سے کام لیا، اس کا نتیجہ ہے کہ عربی ادب کی تاریخ میں انشاء پرداز صاحبِ اسلوب کی حیثیت سے ہمیشہ عبد الحمید الکاتب، ابواسحاق الصابي، ابن العمید، صاحب ابن عباد، ابوبکر خوارزمی، ابوالقاسم حریری اور قاضی فاضل کا نام لیا جاتا ہے، حالانکہ ان کی تحریروں کا بڑا حصہ مصنوعی، زندگی اور روح سے محروم اور تاثیر سے خالی ہے، ان کے مقابلہ میں امام حسن بصری، فضیل بن عیاض، بشر الحافی، حارث المحاسبی، جنید بغدادی، امام غزالی، الشیخ عبد القادر جیلانی، ابن جوزی، جلال الدین رومی، علامہ ابن تیمیہ، ابن شداد، شیخ محی الدین ابن عربی، ابوحیان توحیدی، ابن قیم، ابن خلدون، کہیں بڑھ کر انشاء پرداز کہلانے کے مستحق ہیں اور ان کے کلام اور تصنیفات میں صحیح اور طاقتور انشاء، خیالات اور جذبات کے اظہار اور انسانی تأثرات واحساسات کی تصویر کے نہات دلکش اور دل آویز نمونے ہیں، لیکن ان بے گناہوں کا گناہ یہ ہے کہ انہوں نے کبھی ادب وانشاء کو اپنا مستقل پیشہ یا اظہار کمال کا ذریعہ نہیں بنایا، اور ان کی اکثر تحریروں کا موضوع دینی یا علمی ہے۔

تحریر وتقریر کو بہتر وکامیاب بنانے کے لئے جتنی صفات اور صلاحیتیں اور بلاغت کے اصول وقوانین ضروری ہیں، ناقدین ادب نے ان سب کا جائزہ لیا ہے اور ہر عہد میں ان پر بحث ہوتی رہی ہے، لیکن بہت کم لوگوں کو اس کا احساس ہوا ہے کہ ان صفات اور صلاحیتوں میں ایک بڑا مؤثر اور ناقابل فراموش عنصر یا عامل صاحب کلام کا اخلاص اور دردمندی ہے۔ ادب وانشاء کے ذخیرہ کا اگر ایک نئے اور زیادہ حقیقت پسندانہ اور گہرے نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے تو اس کو دو قسموں پر تقسیم کرنا بے جا نہ ہوگا۔ ایک وہ تحریریں اور اظہار خیال جو اندرونی تقاضہ اور داعیہ اور کسی طاقتور عقیدہ یا یقین کے ماتحت وجود میں آئیں اور ان سے مقصود کسی فرمائش یا حکم کی تعمیل، یا کوئی دنیاوی منفعت، یا کسی صاحب اقتدار یا صاحب ثروت انسان کی رضامندی نہیں تھی، بلکہ وہ خود اپنے ضمیر یا عقیدہ کے فرمان کی تعمیل تھی جس میں اہل حکومت اور اہل ثروت کے فرمان

سے زیادہ قوت ہوتی ہے اور جس سے سرتابی کرنا کسی صاحب ضمیر انسان کے بس میں نہیں ہے۔

دوسری قسم وہ ہے جو کسی فرمائش کی تعمیل یا کسی دنیاوی منفعت کے حصول یا کسی بالاتر انسان کے حکم کی تعمیل میں ہو۔

ادب کی ان دونوں قسموں میں زمین آسمان کا فرق ملے گا۔ پہلا ادب ''ہر کہ از دل خیزد بر دل ریزد'' کا مصداق ہے، وہ طویل عرصہ تک زندہ رہتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر اس کا موضوع دینی یا اخلاقی ہے تو اس کا قلب اور اخلاق پر گہرا اور انقلاب انگیز اثر پڑتا ہے، ہزاروں آدمیوں کے دل میں اس کے پڑھنے سے اصلاح کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف دوسری قسم کا ادب داد و تحسین اور عارضی سرور و خوش وقتی کے سوا روح اور قلب پر اپنا کوئی دیرپا اثر نہیں چھوڑتا۔ اس کی زندگی اور عمر محدود اور مختصر ہوتی ہے۔ پہلے ادب میں بےساختگی اور بےتکلفی ہوتی ہے۔ دوسرے ادب میں صنعت اور اہتمام، ادب کی بارگاہ میں بےادبی نہ ہو تو ان دونوں قسموں میں وہی فرق ہے جو ایک تمثیلی حکایت میں بیان کیا گیا ہے کہ کسی نے ایک شکاری کتے سے پوچھا کہ: ''ہرن بھاگنے میں تم سے کیوں بڑھ جاتا ہے اور تم اس کو کیوں نہیں پکڑ لیتے ؟۔ اس نے جواب دیا: ''اس لئے کہ وہ اپنے لئے دوڑتا ہے اور میں اپنے آقا کے لئے''۔

(تاریخ دعوت وعزیمت، از: مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، حصہ سوم، ص: ۲۴۱-۲۴۴)۔

بعض حکماء نے لکھا ہے کہ ادب کے باب میں لوگوں کی تین قسمیں ہیں:

(۱) دنیادار (۲) دیندار (۳) صوفیاء۔ جہاں تک دنیادار ادبا کا تعلق ہے تو ان کے ادب میں فصاحت و بلاغت اور علم کا عنصر غالب ہوتا ہے اور منظوم اور منثور کلام کا اعادہ ہوتا ہے۔ اور دین دار ادبا کے ادب میں تزکیۂ نفس، زہد و تقشّف کسر نفس، ترک خواہشات اور دینی حدود کی پابندی کا غلبہ ہوتا ہے۔ رہا صوفیا کا کلام تو اس میں طہارت وتقوی، ذکر و عبادت، ایفائے عہد، دل کی پاکیزگی، معاملات کی درستگی، قرب الٰہی اور رضائے الٰہی کے حصول میں حسنِ ادب وصدق طلب، اخلاص وللّٰہیت کا پرتو اور عشق و مستی سے بھرپور اور معرفت ومحبت کا شراب طہور نظر آتا ہے۔

(رسالۃ المسترشدین، از: حارث محاسبی، تحقیق شیخ عبد الفتاح ابوغدہ)

علامہ ابن قیم الجوزیہ نے دل کی تین قسمیں بیان کی ہیں (۱) پاک دل (۲) مردہ دل (۳) بیمار دل۔

''پاک اور صحیح دل وہ دل ہے جس کا حامل ہی قیامت کے دن نجات پائے گا، ارشاد باری تعالی ہے {يوم لا ينفع مال ولا بنون، إلا من أتى الله بقلب سليم} [سورہ شعراء: ۸۸-۸۹] (جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے سکے گا اور نہ بیٹے، ہاں جو شخص خدا کے پاس پاک دل لیکر آیا وہ بچ جائے گا)

لہٰذا پاک دل وہ ہے جو ہر طرح کے شرک سے پاک وصاف ہو، بلکہ اس کا ہر ہر عمل اللہ ہی کے لئے ہو، قصد و ارادہ، تعلق ومحبت، توکل وانابت اور خوف ورجاء، ہر حال میں مالک حقیقی اللہ رب العالمین ہی کی رضا پیش نظر ہو۔

مردہ دل اس کے برعکس ہے، اس میں نہ تو زندگی ہوتی ہے

اور نہ ہی معرفت الٰہی، نہ تو اس میں عبادت و بندگی کا رتی بر جذبہ ہوتا ہے اور نہ ہی حب الٰہی اور خوف خدا، بلکہ وہ خواہشات کا رسیا اور نفس کا غلام ہوتا ہے۔

بیمار دل وہ ہے جس میں زندگی تو ہوتی ہے لیکن بیماری وفساد کا مادہ بھی ہوتا ہے، گویا کہ اس میں دو مادے ہوتے ہیں، جو ایک دوسرے کی مدد کرتے رہتے ہیں، اور جب جس مادہ کا غلبہ ہوجاتا ہے دل اسی کے راستہ پر چل پڑتا ہے، لہذا اس میں حب خدا، خوف خدا، ایمان باللہ، توکل علی اللہ اور للّٰہیت بھی ہوتی ہے جو اس کے صحت مند اور زندہ رہنے کا مادہ ہے، اور اس میں حب نفس، بغض وحسد، کبر ونخوت، عجب پسندی، استعلاء وبڑائی اور غرور وتکبر بھی پایا جاتا ہے جو اس کی ہلاکت وبربادی اور فساد کا سبب بنتا ہے۔

لہٰذا پاک دل زندہ، صالح، خاشع، نرم اور بیدار دل ہے، دوسرا خشک اور مردہ ہوتا ہے، اور تیسرا بیمار ہوتا ہے جو کبھی صحیح راہ پر چلتا ہے اور کبھی فساد اور بگاڑ کی طرف‘‘۔(طب القلوب/علامہ ابن قیم الجوزیہ، ص: ۳۴-۳۹)۔

دل کا اثر صرف انسان کے اعمال واخلاق اور سلوک ہی پر نہیں پڑتا، بلکہ علماء ادب کہتے ہیں کہ اس کا انسان کے کلام پر بھی پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اہل دل کا کلام اس کلام سے جدا ہوتا ہے جو دل سے نہیں نکلتا۔ جاحظ نے ’’البیان والتبیین‘‘ میں عامر بن عبد القیس کا قول نقل کیا ہے کہ جو بات دل سے نکلتی ہے وہ سیدھے دل میں گھر کرجاتی ہے، اور جو بات صرف زبان سے نکلتی ہے وہ کانوں سے آگے نہیں بڑھتی‘‘ ہر کہ از دل خیزد بر دل ریزد۔

حسن بصری رضی اللہ عنہ نے ایک بے اثر واعظ کے کلام کو سن کر کہا تھا کہ اے واعظ خشک! یا تو تیرے دل میں کوئی خرابی ہے یا پھر میرے دل میں‘‘۔

سیرت وسوانح اور تاریخ کی کتابوں میں صلحاء، زہاد، پابند شریعت علماء اور اہل دل کے مؤثر کلام کا بیش بہا خزینہ موجود ہے، اور تزکیۂ نفس، طہارت قلب اور سنگ دلوں کی اصلاح وتربیت میں اہل دل کے مواعظ کی حیرت انگیز اثر آفرینی کے سیکڑوں واقعات اور حکایات موجود ہیں، جو ادب عالی کا شاہکار ہیں، لیکن مصنوعی ادب کے پروردہ اور دلدادہ حضرات نے اس پر توجہ نہ دی، سوانح نگاروں اور مؤرخین نے ایسے سیکڑوں اہل دل حضرات کا تذکرہ ہے جن کے مواعظ نے دلوں کی دنیا بدل دی۔

ان میں ایک ابوسعید حسن بصری (متوفی ۱۱۰ھ) ہیں، جن کے وعظ کی اثر آفرینی کا نتیجہ تھا کہ فرزدق جیسا بلا کا مے نوش شاعر آپ کی مجلس میں اپنی بدکرداری سے رو رو کر توبہ کرتا تھا، ایک بار تو اس نے اپنے آپ کو ایک ستون سے باندھ دیا اور یہ عہد کیا کہ جب تک وہ قرآن مجید حفظ نہیں کرلے گا اس وقت تک رسی نہیں کولے گا، فرزدق نے اپنے ان احوال کو مختلف قصیدوں میں بیان کیا ہے، تراجم اور سوانح کی کتابیں حسن بصری کے مواعظ کی تاثیر کے قصوں سے بھری ہوئی ہیں۔

مشہور امام لغت ونحو ابوعمرو بن العلا کہتے ہیں کہ میں نے حسن بصری اور حجاج بن یوسف سے بڑھ کر فصیح نہیں دیکھا اور حسن حجاج سے زیادہ فصیح تھے‘‘۔

مثال کے طور پر حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک وعظ میں کہتے ہیں:۔

’’ہائے افسوس! لوگوں کو امیدوں اور خیالی منصوبوں نے

غارت کیا، زبانی باتیں ہیں، عمل کا نام ونشان نہیں، علم ہے مگر اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے صبر نہیں، ایمان ہے مگر یقین سے خالی، آدمی بہت نظر آتے ہیں مگر دماغ نایاب، آنے جانے والوں کا شور ہے مگر ایک بندۂ خدا ایسا نظر نہیں آتا جس سے دل لگے، لوگ داخل ہوئے اور پھر نکل گئے، انہوں نے سب کچھ جان لیا پھر مکر گئے، انہوں نے پہلے حرام کیا پھر اسی کو حلال کرلیا، تمہارا دین کیا؟ زبان کا ایک چٹخارہ! گر پوچھا جاتا ہے کیا تم روز حساب پر یقین رکھتے ہو؟ تو جواب ملتا ہے کہ ہاں ہاں! قسم ہے روزِ جزا کے مالک کی، غلط کہا، مومن کی شان تو یہ ہے کہ وہ قوی فی الدین ہو، صاحب ایمان ویقین ہو، اس کے علم کے لیے حلم اور اس کے حلم کے لیے علم باعث زینت ہو، عقلمند ہو، لیکن نرم خو، اس کی خوشپوشی اور ضبط اس کے فقر وافلاس کی پردہ داری کرے، دولت ہو تو اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، خرچ کرنے میں شفیق، خستہ حالوں کے حق میں رحیم وکریم، حقوق کی ادائیگی میں کشادہ دست وفراخ دل، انصاف میں سرگرم وثابت قدم، کسی سے نفرت ہو تو اس کے حق میں زیادتی نہ ہونے پائے، کسی سے محبت ہو تو اس کی مدد میں حدِ شریعت سے نہ بڑھنے پائے۔۔۔۔‘‘۔

(تاریخ دعوت وعزیمت، از: مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، حصہ اول، ص:۵۸)

مشہور اہل دل میں جن کے کلام کو مؤرخین ادب نے ادب میں شمار کیا ہے اور ان کے مؤثر مواعظ کا تذکرہ سوانح اور تاریخ کی کتابوں میں جا بجا ملتا ہے مندرجہ ذیل ہستیاں ہیں:۔

فضیل بن عیاض (متوفی ۱۸۷ھ) ابومحفوظ معروف ابن فیروز کرخی متوفی ۲۰۰ھ، ابوالفیض ذوالنون مصری متوفی ۲۴۵ھ، حارث محاسبی متوفی ۲۵۳ھ، ابوالحسن سری بن المغلس بن السقطی متوفی ۲۵۳ھ، ابو محمد سہل بن عبد اللہ تستری متوفی ۲۸۳ھ، ابوالقاسم جنید بن محمد بن جنید بغدادی متوفی ۲۹۷ھ، احمد بن محمد بن سہل بن عطاء متوفی ۳۰۹ھ، ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن قشیری صاحب ’’الرسالہ‘‘ متوفی ۴۶۵ھ، حجۃ الاسلام ابو حامد محمد غزالی متوفی ۵۰۵ھ صاحب احیاء العلوم، شیخ عبد القادر جیلانی متوفی ۵۶۱ھ، ابوالفرج عبدالرحمن ابن جوزی متوفی ۵۹۷ھ، وغیرہم۔

ان اہل دل حضرات کے حکیمانہ اقوال اور مؤثر مواعظ آج بھی وہی تازگی، حلاوت، لطافت اور تاثیر رکھتے ہیں جو اول روز ان میں موجود تھی، ان میں ذہنی وعقلی افکار وخیالات، قلبی ودلی احساسات وجذبات اور نفسیاتی رجحانات ومیلانات کی ترجمانی پائی جاتی ہے، ان کے مواعظ تیر ونشتر کا کام کرتے ہیں، اور اپنی دل آویزی اور دل نشینی کے علاوہ اس دور کی فصیح وبلیغ زبان اور اعلی ادب کا نمونہ ہیں۔ ان کے مطالعہ سے دل میں گداز اور نرمی پیدا ہوتی ہے، شعور ووجدان میں بالیدگی واہتزاز پیدا ہوتا ہے اور زندگی کا رخ اور دھارا بدل جاتا ہے۔ اور حقیقی معنوں میں ادب وہی ہے جو انسان کے شعور ووجدان کو مہمیز لگائے اور زندگی کو تعمیری رخ پر لگادے۔

ہندوستان بھی ایسی زندہ اور روشن دل ہستیوں سے خالی نہیں رہا ہے، یہ ہستیاں صرف صاحب قال اور صاحب کمال ہی نہ تھیں، بلکہ صاحب دل اور صاحب حال بھی تھیں، وہ جو کچھ کہتے تھے، ان کے دل سے نکلتا تھا، اس لئے دل پر اثر کرتا تھا، جس وقت وہ وعظ فرماتے سراپا درد واثر ہوتے تھے، اس کا نتیجہ تھا کہ اگرچہ بڑے

بڑے ارباب فضل وکمال موجود تھے مگر ان کی مجلسوں میں مقناطیس کی سی کشش تھی اور مواعظ و بیانات میں شہد کی سی حلاوت و چاشنی او تاثیر تھی، کہ دور دور سے لوگ کشاں کشاں اور دیوانہ وار کھنچے چلے آتے تھے، دلوں کی سرد انگیٹھیاں گرما جاتی تھیں اور سخت دل موموم ہوجایا کرتے تھے، ان مشہور اہل دل میں شیخ فرید الدین مسعود ایودھنی متوفی ۶۶۴ھ، شیخ بہاء الدین زکریا بن محمد ملتانی متوفی ۶۶۶ھ، شیخ نصیر الدین چراغ دہلی متوفی ۷۵۷ھ، شیخ نظام الدین بدایونی متوفی ۷۲۵ھ، مجدد الف ثانی امام ربانی شیخ احمد بن عبد الاحد سرہندی متوفی ۱۰۳۴ھ ہیں۔

مجدد الف ثانی کے شیخ باقی باللہ متوفی ۱۰۱۴ھ جو کابل سے ہندوستان پہونچے تھے، ان کا شمار ان اہل دل میں ہوتا ہے جن کے کلام کو سنتے ہی دل کی دنیا بدل جاتی ہے، مؤرخین کا بیان ہے کہ جو بھی ان کی مجلس میں حاضر ہوا اس کی کایا پلٹ ہوگئی۔ مجدد الف ثانی کے خطوط اپنے درد و اخلاص، جوش و تاثیر، زور قلم اور قوت انشاء کے لحاظ سے ان خطوط ومکاتیب کے مجموعے میں جو دنیا کی کسی زبان میں اور کسی دینی اصلاح وتحریک کی تاریخ میں سپرد قلم کیے گئے ہیں، خاص امتیاز رکھتے ہیں اور سیکڑوں برس گزر جانے کے باوجود آج بھی ان میں اثر و دل آویزی پائی جاتی ہے، اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے مکتوب الیہم کے دلوں پر کیا اثر ڈالا ہوگا، حقیقت میں یہی خطوط مجدد الف ثانی کی دعوت وتبلیغ کے قاصد، ان کے زخمی دل کے صحیح ترجمان، ان کے قطرات اشک اور ان کے لختہائے جگر ہیں، اور دسویں صدی میں ہندوستان میں مغلیہ سلطنت میں جو عظیم انقلاب رونما ہوا اس میں ان کا بنیادی حصہ اور سب سے بڑا دخل ہے۔ ان خطوط کا بڑا ادبی مقام ہے، ان خطوط میں جو ادبیت اور تاثیر پائی جاتی ہے وہ دنیا کی کسی دوسری زبان کے خطوط میں نہیں ملتی، اسی طرح ان کے خلفاء اور شاگرد شیخ آدم بنوری، متوفی ۱۰۵۳ھ، شیخ محمد معصوم متوفی ۱۰۷۹ھ اور ان کے خلفاء و نائبین، شیخ الاسلام احمد بن عبد الرحیم معروف بولی اللہ دہلوی متوفی ۱۱۷۶ھ، اور ان کے خلفاء، شیخ مرزا مظہر جان جاناں متوفی ۱۱۹۵ھ اور شیخ عبد العزیز دہلوی متوفی ۱۲۳۹ھ کے خطوط، مواعظ اور بیانات میں بڑی دل آویزی اور مقناطیس کی جاذبیت آج بھی پائی جاتی ہے، شیخ عبد العزیز دہلوی نے ادبی اسلوب خصوصا اردو زبان کی تہذیب وتنقیح اور ترقی میں بڑا رول دادا کیا ہے۔ (ادب اہل القلوب، از: مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی، ص: ۱۷-۲۱)۔

صلحاء اور اہل دل کے کلام میں جو غیر معمولی حلاوت، قوت اور جاذبیت ہے وہ ان کی روح کی لطافت اور قلب کی پاکیزگی، اخلاص وللّٰہیت، حب الٰہی اور عشق نبوی اور اندرونی کیفیت و سرمستی اور سوز دروں کا نتیجہ ہے، اندرونی کیفیت اور سوز دروں دلوں کو مسخر کر لیتا ہے، سنگ دلوں کو موم بنا دیتا ہے، جلال الدین رومی کہتے ہیں:

''سوز دروں اور محبت تلخ کو شیریں بنا دیتی ہے، مٹی کو سونا بنا دیتی ہے، گدلے کو شفاف بنا دیتی ہے، درد کو دوا میں تبدیل کر دیتی ہے، قید خانہ کو چمن زار میں تبدیل کر دیتی ہے، بیماری کو نعمت بنا دیتی ہے، ظلم کو رحمت بنا دیتی ہے، محبت لوہے کو پگھلا دیتی ہے، پتھر کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے، مردہ کو زندہ کر دیتی ہے اور غلام کو آقا بنا دیتی ہے''۔

وہ کہتے ہیں:۔

''یہ محبت وہ پنکھ ہے جس کے ذریعہ مادی انسان فضا میں پرواز کرتا ہے، اور ثری سے ثریا پہونچ جاتا ہے اور جب

یہی محبت پہاڑوں میں سرایت کر جاتی ہے، تو وہ جھومنے لگتے ہیں''۔

صلحاء اور اہل دل کے کلام کی یہ دل آویزی اور تاثیر کا اصل منبع ان کے قلوب کی پاکیزگی، مجاہدہ نفس، زہد و بے رغبتی، فنا فی اللہ، معرفت الٰہی، ایمان ویقین روح کی لطافت وذکاوت، تقوی وخشیت الٰہی اور اخلاق کی درستگی ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''ادب وانشاء کے سلسلہ میں عام مؤرخ ونقاد اکثر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ تحریر کی قوت، کلام کی تاثیر اور قبول عام وبقائے دوام کے لئے سب سے زیادہ معاون عنصر لکھنے والے کی اندرونی کیفیات، اس کا یقین، دلی جذبہ، کسی حقیقت کے اظہار کے لئے اس کی بے چینی وبے قراری ہے، ایسے کسی شخص کو جو اس اندرونی کیفیت سے سرشار اور اس کو دوسروں میں پیدا کرنے کے لئے مضطرب وبے قرار ہو جب قدرت کی طرف سے ذوق سلیم بھی عطا ہو، الفاظ واسالیب بیان پر ضروری حد تک قدرت بھی حاصل ہو اور اس کی تحریر میں علم وادب، عقل و استدلال اور حسن بیان کے ساتھ سوز دروں اور خون جگر بھی شامل ہو تو اس کی تحریر میں ایسا اثر اور ایسا زور پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں ہزاروں دلوں کو زخمی کرتی ہے اور سیکڑوں برس گزر جانے کے بعد بھی اس کی تازگی اور زندگی اور اس کی تاثیر اور قوتِ تسخیر قائم رہتی ہے''۔

مفکر اسلام آگے لکھتے ہیں:۔

''ناقدین ادب نے وقت، ماحول، فضا اور طبیعت کے فراغ کو ادب وشاعری کے لئے بہت زیادہ سازگار اور معاون عنصر تسلیم کیا ہے اور بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے اس کا اظہار کیا ہے، کہ لب جو، کنار دریا، گوشۂ چمن، فصل بہار، نسیم سحر، صبح کا سہانا وقت، ان کی شاعری اور ان کے ادب کے لئے محرک بن جاتا ہے، اور ان میں بہت لوگ ایسے مقام کی تلاش اور ایسے وقت کے انتظار میں رہتے ہیں، اس طرح یہ حقیقت تسلیم کر لی گئی کہ روح کی لطافت اور دماغ کا سکون ادبیات کے لئے بہت معاون ہے''۔

بعض اہل دل کے کلام میں جو غیر معمولی حلاوت وقوت ہے، وہ ان کی روح کی لطافت اور قلب کی پاکیزگی اور اندرونی کیفیت اور سرمستی کا نتیجہ ہے، اور اس کے لئے وہ کسی خارجی مدد، مقام اور وقت کے محتاج نہیں ہوتے، ان کی خوشی وسرمستی کا سرچشمہ اور ان کی دولت کا خزانہ ان کے دل میں ہوتا ہے، خواجہ میر درد نے جو خود صاحب دل اور صاحب درد تھے اس پورے گروہ کی ترجمانی اس شعر میں کی ہے۔

جایئے کس واسطے اے درد میخانے کے بیچ
کچھ عجب مستی ہے اپنے دل کے پیمانے کی بیچ

غرض اس باطنی کیفت، یقین ومشاہدہ، دعوت کے غلبہ، اہل عصر اور اہل تعلق کو حقائق سے آگاہ کرنے اور منزل مقصود پر پہنچانے کے جذبۂ اخلاص، دردمندی، روح کی لطافت، قلب کی پاکیزگی اور اس سب کے ساتھ ذوق سلیم اور زبان پر قدرت نے اہل دل کو ایک بلند ادبی مقام عطا

کیا ہے'' (تاریخ دعوت وعزیمت، از: مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، حصہ سوم، ص: ۲۴۴)۔

اور جب کلام سلیم الطبع اور ہر طرح کی آلائشوں اور آلودگیوں سے پاک شخص کے زبان سے نکلتا ہے تو وہ اثر رکھتا ہے، کتب تاریخ میں اس کی سیکڑوں مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں، احمد بن عرفان شہید کے متعلق بیان کیا جاتا ہے، کہ آپ کی مجلس میں چور، ڈکیت، قاتل فساق وفجار، رورو کر توبہ کرتے تھے، جب آپ کا قافلہ کلکتہ پہونچا تو آپ کی مجلسوں کے اثر سے میخانے بند ہو گئے۔

ابن جوزی کی مجالس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سارے بغداد کو زیروزبر کر رکھا تھا، خلفاء وسلاطین، وزراء اور اکابر علماء ان میں بڑے اہتمام سے اور بڑے شوق سے شرکت کرتے تھے، ہجوم کا یہ حال تھا کہ ایک ایک لاکھ آدمی ایک ایک وعظ میں شمار کیے گئے، دس پندرہ ہزار آدمیوں سے تو کسی طرح کبھی کم نہ ہوتے، تاثیر کا یہ عالم تھا، کہ لوگ غش کھا کھا کر گرتے، وجد وشوق میں گریباں پھاڑتے، لوگوں کی چیخیں نکل جاتیں، آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتیں، توبہ کرنے والوں کا کچھ شمار نہ تھا۔''

(صید الخاطر، منقول از: تاریخ دعوت وعزیمت از: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حصہ اول، ص: ۲۳۳)۔

مختصر یہ کہ اہل دل کے کلام نے دنیا کے افکار وادبیات پر گہرا اور دیرپا اثر ڈالا، ادبیات عالم میں ایسی شاذونادر کتابیں ملیں گی جنھوں نے دنیا کے اتنے وسیع حصہ کو متاثر کیا ہو جتنا کہ اہل دل کے کلام نے متاثر کیا ہے، دنیا کے عقلی، علمی اور ادبی حلقے ان کے ملفوظات ومواعظ سے صدیوں سے گونجتے چلے آرہے ہیں، اور دماغ کو نئی روشنی اور دلوں کو نئی حرارت بخش رہے ہیں، ان سے ہر دور میں شاعروں، ادیبوں اور اہل ذوق کو نئے مضامین، نئی زبان، نیا اسلوب ملتا رہا، اور وہ ان کے قوائے فکر اور ادبی صلاحیتوں کو ابھارتے رہے، ان سے بے چین طبیعتوں کو سکون واطمینان ملتا رہا، اور عالم اسلام کے فکری تعطل، ادبی جمود، تقلیدی ادب اور علم کلام پر کاری ضرب لگائی۔

اہل دل کے کلام کی برتری، اثرانگیزی، قوت اور دل آویزی کا راز صرف اس حقیقت میں مضمر نہیں ہے کہ یہ سجع اور محاسن بدیع کی قیود سے پاک ہیں، سلیس اور رواں ہیں، بلکہ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان تحریروں کا باعث ومحرک عقیدہ اور جذبۂ دل ہے، یہ تحریریں ایک مسئلہ پر مکمل اطمینان قلب ہوجانے کے بعد، پورے جوش اور لگن کے ساتھ لکھی گئی ہیں، لہٰذا مناسب یہ ہے کہ ازسرنو کتبِ ادبیات کے علاوہ سیروسوانح اور تاریخ کے ذخیرہ کتب کو کھنگالیں اور اپنے نونہالوں اور نئی نسل کے سامنے ان کتابوں سے ادب واخلاق کے نمونے پیش کریں تاکہ وہ اس زبان کی چاشنی اور حلاوت سے لطف اٹھائے، اس کی نشوونما اس طرح ہو کہ وہ صحیح اور بلیغ اسلوب میں مافی الضمیر کی ادائیگی پر قادر ہونے کے ساتھ ساتھ اس وسیع کتب خانے سے آگاہ ہو اور اس سے استفادہ کرسکے اور صلحاء کی زندگی سے فائدہ اٹھا کر ذہنی سکون اور قلبی اطمینان حاصل کرسکے اس لیے کہ اس مادی دور میں یہ عنصر عنقا ہوتا چلا جارہا ہے اور مغربی ثقافت وتمدن کے اثر سے اخلاقی قدریں مفقود ہوتی جارہی ہیں اور مادیت غالب آگئی ہے۔

۞۞۞

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ
ادب اسلامی کے نقیب

محمد نفیس خان ندوی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نور اللہ مرقدہ ایک نامور عالم دین، ایک بلند پایہ مصنف، ایک صاحب طرز ادیب، ایک بلند پایہ مصنف اور ایک منفرد سیرت نگار تھے، لیکن سب سے بڑھ کر وہ ایک داعی، ایک مصلح اور ایک صاحب دل مربی تھے، ان تمام اوصاف کے اجتماع نے انھیں احیائے فکر اسلامی کے معماروں میں ایک درخشاں مقام پر متمکن کیا تھا، اکیسویں صدی کا ایک صاحب علم ومعرفت جب عہد حاضر کی اسلامی فکر کی قوس وقزح پر نظر ڈالے گا تو اسے مولانا کی ذات میں علم وادب اور فکر واسلوب کا ایک ایسا گلدستہ نظر آئے گا جس میں گذشتہ دور کے کئی اہم مفکرین، مصنفین اور داعیوں کے متفرق پہلوؤں کا حسین پرتو ہے، ان کے یہاں علامہ اقبالؒ کا سوز وگداز، مولانا مودودیؒ کی عقلیت، علامہ شبلیؒ کا ذوق تاریخ، علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تصور دین کی جامعیت، مولانا محمد الیاسؒ، مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ، اور مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی روحانیت اور احسان کا امتزاج نظر آئے گا، اور علوم ومعارف کا ایک ایسا دریا دکھائی دے گا جس کا سرچشمہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ذات گرامی تھی جنھیں عہد شباب میں ہی حکیم الامت نے ''مجمع الکمالات'' سے مخاطب کیا تھا۔

ہمارے ملک میں جدید وقدیم کی تفریق سے قبل جو نظام تعلیم رائج تھا وہ علوم دینیہ وعلوم عصریہ دونوں کا جامع تھا، اس نصاب کے اثرات سماج کے ہر ایک شعبہ میں واضح ونمایاں تھے، خواہ ملک کے اعلیٰ عہدے و مناصب ہوں، فلسفہ ومنطق کی بحثیں ہوں، قرآن وحدیث کی مسندیں ہوں یا شعر وادب کی محفلیں، ہر طبقہ اسی نصاب کا فیض یافتہ اور اسی نظام کا پروردہ تھا۔ ادب وانشاء، تحریر وتصنیف، نقد سخن، شاعری اور سخن سنجی کا مذاق و سلیقہ پیدا کرنے کے لیے کوئی متوازی نظام تعلیم موجود نہ تھا، الغرض مسند درس پر بیٹھ کر قرآن وحدیث کا درس دینے والے علماء ہی علمی وادبی محفلوں کے صدر نشیں ہوا کرتے تھے اور اُنہیں کا قول ان اصناف میں حجت مانا جاتا تھا، ملک میں یہی طبقہ سب اعلیٰ تعلیم یافتہ تسلیم کیا جاتا تھا، مثال کے طور پر مولوی امام بخش صہبائی، مولانا عبیداللہ خاں علوی، صدرالدین آزردہ اور مولانا فضل حق خیرآبادی وغیرہ جس طرح علوم دینیہ میں حجت تسلیم کیے جاتے تھے اسی طرح زبان فہمی، نکتہ شناسی اور سخن سنجی میں بھی وہی سنگ میل تھے۔ اسی نصاب کی بدولت ایسے باکمال علماء پیدا ہوتے رہے جن کے ہاتھ میں علمی وادبی قیادت رہی، حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ کے نانا مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ اور پھر

مولانا کے بڑے ماموں مولانا حکیم سید عبدالعلی حسنیؒ (ایم بی بی ایس) اس زریں سلسلہ کی آخری کڑیوں میں سے تھے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ جس زمانہ میں پیدا ہوئے اس زمانہ میں علم وادب کی سرحدیں قائم ہو چکی تھیں، عصری جامعات اور دینی مدارس کے موضوعات اور زبان وبیان کے اسلوب تقسیم ہو چکے تھے، ادیب وشاعر ہونا، ناقد وفن کار بننا، سلیس وشیریں اسلوب اختیار کرنا عصری دانشوروں کا حق تھا جبکہ علمائے مدارس کے لیے خشک وبے مزہ ہونا، زبان وبیان کے حسن وقبح سے ناواقف ہونا اور ایک گنجلک سا اسلوب اختیار کرنا عمومی شناخت بن گئی تھی، بالفاظ دیگر ایک ادیب وانشاء پرداز کو علوم دینیہ سے سروکار نہیں تھا تو ایک فقیہ ومحدث کے لیے ادیب وانشاء پرداز ہونا روا نہیں تھا۔

لیکن حضرت مولانا مرحوم ایک بے ذوق وخشک عالم نہ تھے، وہ علوم دینیہ کے فاضل ومتبحر عالم ہونے کے ساتھ مشہور اہل قلم اور ممتاز ادیب بھی تھے؛ ایک ایسا ادیب جو خالص مذہبی ماحول اور دینی مدرسہ کے پروردہ تھا مگر اس کی علمی وادبی رُخِ روشن کی چمک اور فکر وفرہنگ کے اس گوہر درخشاں کی دمک نے معاصرین کی نگاہوں کو خیرہ کر رکھا تھا، اس کی نگارشات نے اصحاب ادب وانشاء سے جو خراج وصول کیا اور معاصر دنیا کے علمی وادبی حلقوں سے جو پذیرائی حاصل کی شاید ہی کسی دوسرے قلمکار کے نصیب میں آئی ہو۔

حضرت مولانا نے دسیوں کتابیں تصنیف کی ہیں اور سیکڑوں مضامین لکھے ہیں، لیکن موضوعات کے تنوع اور رنگارنگی کے باوجود زبان وادب کا رشتہ کہیں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا، خشک اور علمی موضوع کو بھی ان کا ولولہ انگیز اور بہار آفریں قلم شگفتہ اور تازہ بنا دیتا ہے، تاریخ وجغرافیہ جیسے مضامین ان کے بیان کی دل آویزی اور تحریر کی حلاوت کی وجہ سے ادب وانشاء کے حسین گلدستے بن جاتے ہیں، وہ اپنے فطری وادبی ذوق اور انشاء پردازی کی خداداد صلاحیت سے سادہ واقعات اور خشک تحریروں میں بھی ایسی کشش وجاذبیت پیدا کر دیتے ہیں کہ دل بے ساختہ وجد کرنے لگتا ہے اور طبیعت پھڑک اٹھتی ہے۔

مثال کے طور پر الفاظ کی اثر آفرینی سے متعلق تحریر کرتے ہیں:

''الفاظ جب صاحب الفاظ کے احساس وتاثر کو، اس کی خوش دلی اور بد دلی کو، اس کے جذبے وتڑپ کو، اس کے کیف ومسرت اور اس کی رنجوری ودل فگاری کو ادا کرنے کی صلاحیت کا ثبوت دیتے ہیں تو وہ ادب کا ساز بن جاتے ہیں، اور جب الفاظ کسی صاحب علم کے علم وتحقیق کو، اس کی عقلی کاوش اور اس کے نتیجہ فکر کو اور اس کے نقطۂ نظر کو سنجیدہ انداز میں پیش کرنے کا کام کرتے ہیں تو علم وواقفیت کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔'' (غبار کارواں/ ۸۰)

اسی طرح خط کے ادبی حسن کو یوں بیان کرتے ہیں:

''انسانی کام ودہن سے نکلنے والے الفاظ جس طرح اپنا صوتی تصور پیش کرتے ہیں اسی طرح لکھنے والے کے وجدان وشعور کی چھاپ بھی اپنے مخاطب کے وجدان وشعور پر مرتسم کرتے ہیں، یہی الفاظ خطوط کے دائروں میں بھی اثر بھر دیتے ہیں، اس لیے بعض وقت بے تکلف لکھے جانے والے خطوط بھی رعنائیوں کے حامل بن جاتے ہیں۔'' (غبار کارواں/ ۱۸۲)

جزیرۃ العرب میں ''بدوی عرب'' کا تعارف پیش کرتے

ہوئے لکھتے ہیں:

''جزیرۃ العرب میں بدوی عرب عام طور پر صحرائی علاقوں میں رہتے اور خانہ بدوشی کی زندگی گذارتے، یہ بارش اور پانی کی تلاش میں رہتے، جہاں بارش ہوتی یا جہاں شادابی وزرخیزی ملتی وہاں اپنے جانوروں کے ساتھ جا کر مقیم ہوجاتے ، ان کے دودھ،اون سے اپنا کام چلاتے اور جب تک وہاں شادابی رہتی مقیم رہتے، پھر دوسری جگہ تلاش کرتے، اس طرح صحرانوردی میں زندگی گذارتے، جب کبھی بارش میں زیادہ دیر ہوجاتی تو یہ ان کے لیے بڑے صبر وابتلا کا موقع ہوتا، اور یہ موقع ان کو خاصا پیش آتا رہتا تھا، اسی لیے بارش کا تذکرہ اور اس کی اہمیت کا اظہار ان کے ادب وشاعری میں جابجا ملتا ہے۔''

(جزیرۃ العرب:۱۵۲)

مولانا کے مندرجہ بالا اقتباسات' مولانا کے فطری و برجستہ، شستہ ورفتہ اسلوب کی آئینہ داری کے لیے کافی ہیں جس میں کسی مشاطگی کے بغیر فطرت کی حنابندی کا حسن محض نگاہوں کو خیرہ نہیں کرتا بلکہ دلوں کو اپنی طرف کھینچتا بھی ہے، سادہ اور رواں جملوں میں گہرے معانی اور طویل مباحث کا خلاصہ پیش کردیا گیا ہے۔ مولانا کے اسلوب کی یہ سادگی و پرکاری سہل ممتنع کی سادگی و پرکاری ہے جو دیکھنے میں بہت سہل و بہت آسان لیکن حقیقت میں بہت ریاضت طلب!

مولانا نے جہاں سیرت وسوانح اورجغرافیہ جیسے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے وہیں ایک معلم و مدرس کی حیثیت سے زبان وادب کی تدریس کے لیے نصابی کتابیں بھی مرتب کیں، اس سلسلہ میں ''منثورات من أدب العرب''، ''الادب العربي بين عرض ونقد'' اور ''جزیرۃ العرب'' وہ معروف اور مفید کتابیں ہیں جو دینی مدارس وعصری جامعات کے علاوہ عالم عرب میں بھی اپنی افادیت منوا چکی ہیں۔

منثورات من ادب العرب کی اہمیت اور مولانا کے ذوق ادب کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ رقم کرتے ہیں:

''مختارات اور القراۃ الراشدۃ کے درمیان کڑی کے طور پر خواہرزادہ عزیز مولوی سید محمد رابع ندوی نے ''منثورات'' تالیف کی جس میں ان بہت سے قابل انتخاب نمونوں کو شامل کیا ہے جو ''مختارات'' کے نمونوں کے مقابلے میں نسبتاً آسان لیکن طلبہ کے سامنے آنے کے قابل تھے، ان کے انتخاب میں ان کا صحیح ادبی ذوق اور مطالعہ کرفرما نظر آتا ہے۔'' (کاروان زندگی:۱/ ۲۲۲)

''جزیرۃ العرب'' کو معروف ادیب ونقاد مولانا ماہرالقادریؒ نے ان الفاظ میں خراج پیش کیا ہے:

''جناب مولانا سید محمد رابع حسنی اس کتاب کی تصنیف وتالیف پر علمی دنیا اور خاص طور سے اسلامی دنیا کی طرف سے قدر وستائش کے مستحق ہیں، جغرافیہ کے ساتھ تاریخ وادب کے امتزاج نے اس کتاب کی جامعیت اور افادیت میں اضافہ کردیا ہے۔''

(ماہرالقادری کے تبصرے:۱/ ۱۲۷)

حضرت مولانا کی جملہ کاوشیں دین کی ہمہ گیر اور جامع تصور کی تشریح وتوضیح پر مبنی تھیں، ساری عمر آپ نے مسلمانوں کے دینی

واخلاقی اور علمی وفکری رہنمائی کا فریضہ انجام دیا، مسلمانوں کے نت نئے مسائل سے عہدہ برآ ہوئے، تمام قابل ذکر علمی وفکری اداروں کو مسلسل علمی سرمایہ اور فکری غذا فراہم کرتے رہے، امت مسلمہ کو درپیش آلام ومصائب کو کم کرنے کی خاطر مسلسل کوشش اور سعی پیہم کرتے رہے، لیکن ان وسیع ومتنوع دائرہ کار میں آپ کی بنیادی ترکیز زبان وبیان کی صلابت وشگفتگی پر بھی تھی، چنانچہ ایک کامیاب سوانح نگار، بے عیب صحافی، بے مثال مدرس اور ایک باکمال منتظم ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کو اس کا شدید احساس بھی تھا کہ ادب اپنے اندر ایک عظیم تعمیری وتخریبی صلاحیت رکھتا ہے جو ایک طرف عقائد صحیحہ کی استواری اور صالح وصحت مندر جحانات کی آبیار کی ذمہ داری نبھا سکتا ہے تو دوسری طرف اخلاق انسانی کی پامالی اور معاشرتی انتشار کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے، لیکن اس دور میں؛ جبکہ جدید وطاقتور وسائل کی وجہ سے ادب کی اثر پذیری اور اس کی فرماں روائی کا دائرہ بڑھتا جارہا ہے؛ الحاد وتشکیک کا جو سیلاب کبھی فلسفہ وسائنس یا دیگر موضوعات کے ذریعہ آتا تھا وہ اب ادب کے سہارے سے پھیل رہا ہے۔

مولانا کے الفاظ ہیں:

موجودہ عہد میں جبکہ یورپ کے ادب وثقافت نے یورپ کے استعماری اثر ونفوذ کی مدد سے پورے عالم اسلام پر اثر جمایا؛ اس نے ادب کے اسلامی تصور کو نقصان پہنچایا، اس کے اثر کو کمزور کیا، اور ادب نواز حلقوں میں اس کو مبہم و مشکوک بنا دیا، جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس نئے رجحان سے زیادہ متاثر ہوا، اور اس کے اثر سے پورے عالم اسلامی میں یہ تصور عام ہوا کہ اسلام اور ادب، اور مذہب اور ادب میں کوئی جوڑ نہیں۔ اس تصور کے نتیجہ میں ادب کی وہ قدریں مشکوک ہوگئیں جن کی آبیاری مذہبی ذہن یا مذہبی تصور سے ہوتی ہے۔'' (غبار کارواں/۱۷)

ادب کے راستہ سے جو الحاد اور بے دینی پھیل رہی تھی اس کا سب سے زیادہ شکار بلاد عربیہ تھا، نوجوانوں میں بے راہ روی، اباحیت پسندی اور دین بیزاری کی عمومی ماحول بن رہا تھا، اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہاں پر ادب کی قیادت ایسے طبقہ کے ہاتھ میں تھی جس کو دین سے کوئی مناسبت نہیں تھی، اسلام کی سرکاری و عالمی زبان کو متاثر ہوجانا بڑی تشویش کی بات تھی۔ اس سنگین خطرہ کا ادراک کرنے اور اس سلسلہ میں عملی اقدام کرنے والوں میں سب سے اولین ونمایاں ذات مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (علی میاںؒ) تھی، چنانچہ انھوں نے ایک جگہ تحریر کیا:

''بلاد عربیہ بالخصوص مصر میں تقریباً نصف صدی سے ادب وتنقید اور نوجوانوں کی ذہنی وادبی غذا پہنچانے کے میدان پر ان ادباء واہل قلم کی اجارہ داری قائم ہوگئی تھی جن کے عقائد میں تزلزل، ذہن میں انتشار اور تحریروں میں تشکیکی رجحان پایا جاتا تھا۔'' (کاروان زندگی: ۲/ ۳۲۸)

حضرت مولانا علی میاںؒ نے سب سے پہلے اس خطرہ کے خلاف آواز بلند کی، روایتی والحاد پسند ادباء کے خلاف تحریک چلائی اور اس کی کوشش کی کہ ادب ایک خاص طبقہ کی گھیرابندی سے آزاد ہو اور پھر اپنی حقیقی روح اور اصلی طاقت کے ساتھ سامنے آئے۔ اس سلسلہ میں آپؒ نے ندوۃ العلماء کے ماہانہ رسالہ ''الضیاء'' میں ''الادب النبوي'' کے عنوان سے ایک مؤثر وطاقتور مقالہ تحریر کیا جس میں ان حقیقی اور فطری ادب کی طرف توجہ دلائی جن سے عام

طور پر اغماض کیا جارہا تھا۔

اس کے بعد حضرت مولانا علی میاںؒ نے عملی طور پر مسلسل کوشش جاری رکھی، اور خاصی تعداد میں دعوتی لٹریچر تیار کیا جو اپنی زبان اور ادبی چاشنی میں مصری ادباء کے لٹریچر سے کسی طرح کم نہیں تھا بلکہ دعوتی روح اور جوش دروں کی وجہ سے ان سے بھی فائق تھا، یہی وجہ ہے کہ عالم عربی میں ایک تلاطم برپا ہوگیا اور اہل علم وادب طبقہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ ادب بہر حال ادب ہے خواہ اس کا مصدر کوئی بھی ہو، وہ انسانی حدود وقیود سے آزاد ہے۔

ادب پر سے اجارہ داری کو ختم کرنے اور اس کے دائرہ کو وسیع کرنے کی یہ پہلی آواز تھی جو حضرت والاؒ کی طرف سے بلند کی گئی تھی، یہ آواز صدا بصحرا ثابت نہیں ہوئی بلکہ پوری سنجیدگی سے اس کا نوٹس لیا گیا اور رفتہ رفتہ ایک کارواں تیار ہوگیا جس کی حدی خواں حضرت والا کی ذات گرامی تھی۔

حضرت والاؒ نے جو فکر پیش کی تھی اس کی طرف لوگ کثرت سے متوجہ ہورہے تھے، لیکن اسے مؤثر ومنظم کرنے کے لیے تحریک کی شکل دینے کی ضرورت تھی تاکہ یہ صدا عمومی طور پر لوگوں کے دل و دماغ کو دستک دے سکے اور منظم انداز میں ایسا لٹریچر تیار ہوسکے جو نہ صرف اس راستہ سے اٹھنے والے فتنوں کا سدباب کرے بلکہ قارئین کو بہترین غذا بھی فراہم کرے، لیکن کسی منظم تحریک سے قبل حالات کا جائزہ لینے اور علماء وادباء کے افکار نظریات کا قریب سے مشاہدہ کرنا بھی ضروری تھا چنانچہ حضرت حضرت والاؒ کی قیادت میں ایک عالمی سیمینار کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا جس میں بلاد عربیہ اور وہاں کی جامعات کے اساتذۂ ادب ونقد کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ یہ سیمینار دارالعلوم ندوۃ العلماء میں منعقد ہوا، اور ۱۷ تا ۱۹ / اپریل ۱۹۸۱ء تک جاری رہا اور مثالی وتاریخی کامیابی سے ہمکنار ہوا۔

یہ سیمینار ہندوستان کی تاریخ کا عظیم الشان سیمینار تھا جس کی عظمت کا اندازہ اس کے شرکاء سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''اس مذاکرۂ علمیہ میں حصہ لینے کے لیے متعدد عرب ممالک کے ممتاز فضلاء وادباء نے شرکت کی جن میں دور حاضر کے بلند پایہ مصنفین، فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین، شعراء اور ادباء نے حصہ لیا، اور پوری دلچسپی اور سرگرمی کے ساتھ مباحث میں شریک ہوئے، عام طور پر عرب ممالک کے وفود جس معیار کے ہوتے ہیں ان سے ان ادباء کا علمی درجہ مختلف تھا، یہاں آنے والوں میں بیشتر وہ حضرات تھے جو یا تو کانفرنسوں میں شرکت کے لیے نہیں جایا کرتے اور اگر ملک سے باہر کہیں جاتے تو بہت ہی با مقصد، متعین، علمی موضوع پر مباحثہ میں شرکت کے لیے جاتے ہیں۔''

(دین وادب/ ۵)

عربی واسلامی ادب کے موضوع پر یہ سیمینار ''ادب اسلامی'' کی خشت اول ثابت ہوا جس میں بلاتفریق جدید وقدیم علماء وادباء کے سبھی طبقوں کے نمائندے شریک تھے، سیمینار کی جامعیت اور وسعت کا اندازہ حضرت مولانا محمد رابع حسنیؒ کی اس تحریر سے لگایئے:

''ہندوستان کی نامور جامعات (یونیورسٹیز) اور اسلامی درسگاہوں کے اساتذہ شریک ہوئے، اردو، انگریزی، فارسی کے مقالات کی علیحدہ تنظیم تھی، اور عربی کا علیحدہ سیمینار ہوا، اور دونوں بیک وقت دو مختلف ہالوں میں پوری سنجیدگی، علمی فضا اور شغف وانہماک کے ساتھ انجام پاتے

رہے، عربی مذاکرہ ہال میں جائیے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آپ لکھنؤ میں نہیں بلکہ قاہرہ، دمشق، یا حجاز کے کسی عظیم الشان علمی وادبی اجتماع یا کسی نامور خطیب وادیب کے لیکچر میں ہیں۔"(دین وادب/۷)

ادبیات اسلامی کے اس سیمینار میں یہ سفارش پیش کی گئی کہ ادبیات کے اندر اسلامی تصورات کی تلاش اور مزید ادبی کاموں میں اخلاقی ومذہبی عناصر کو اجاگر کرنے کی تدابیر کی جائیں۔اس میں یہ تجویز بھی پاس ہوئی کہ ادب اسلامی کے عنوان سے ایک مستقل تنظیم بھی بنادی جائے جس کا صدر مقام دارالعلوم ندوۃ العلماء ہو، یہ تجاویز ایک کمیٹی نے مرتب کی تھی جو عرب اساتذۂ ادب پر مشتمل تھی، چنانچہ حسب تجویز "مجلس ادبیات اسلامی" کے نام سے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایک سکریٹریٹ قائم کردیا گیا، اس کی ایک مجلس عاملہ مقرر کی گئی، حضرت مولانا علی میاںؒ اس کے صدر اور حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنیؒ نے ادب اسلامی کے تخیل ومحرکات، اسلامی اور مغربی ادبی تحریکات، اسلامی ادب کی جامعیت، ادب کی طاقت، ادب اور زندگی جیسے موضوعات پر بھرپور مضامین لکھے اور اس تحریک کو فعال وسرگرم رکھنے میں اپنی خداداد اصلاحیتوں کا برمحل استعمال کیا۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ادب اسلامی کا یہ مفہوم قطعاً نہیں ہے کہ ادب کو زندگی کی آسائشات سے بیزار یا زندگی کے کسی خاص گوشہ میں قید کردیا جائے بلکہ ادب اسلامی سے مراد وہ بامقصد ادب ہے جو انسانی ضمیر کی گہرائیوں میں اتر کر اس کے جذبات ورجحانات کو صحیح وبامقصد رخ دے سکے۔بقول حضرت مولانا:

"ادب اسلامی ایک مکمل اور زندگی سے بھرپور ادب ہے، وہ عام دلچسپی اور قدردانی کا مستحق ہے، اس کے ذریعہ ایک طرف ذوق ادب کی تسکین کا سامان مہیا ہوتا ہے، دوسری طرف فطرت سلیمہ کے مطابق زندگی کا ایک جائز اور ضروری تقاضا بھی پورا ہوتا ہے۔"(غبار کارواں/۲۷)

جو عرب ادباء وعلماء اس سیمینار میں شریک ہوئے تھے ان کے دماغوں میں اس تحریک کا بیج پڑ گیا تھا، تین سال تک مسلسل فکر توجہ کے بعد انھوں نے عالمی سطح پر اس تحریک کو فروغ دینے کا ارادہ کیا، اور ۱۷/مئی ۱۹۸۴ء کو حضرت مولانا علی میاںؒ کی قیام گاہ پر ایک جماعت کی شکل میں حاضر ہوئے اور اپنی خواہش کا اظہار کیا، اور "رابطة الادب الاسلامي العالمي" کے نام سے اس تحریک کی تشکیل کی۔

چونکہ یہ عالمی تحریک خالص اسلامی اور ادبی تھی اس لیے اس کی صدارت کے لیے وہی شخصیت موزوں ہوسکتی تھی جس کے اندر یہ دونوں صفات پورے توازن کے ساتھ جلوہ گر ہوں، حضرت مولانا علی میاںؒ صاحب کی شخصیت پر اس کا پوری طرح انطباق ہوتا تھا، وہی اسلام کے ترجمان، ادب کو نیا رخ دینے والے، دنیا کی ایک جانی پہچانی شخصیت تھے، چنانچہ حضرت والاؒ کے نام پر سب کا اتفاق ہوا، اور مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کو اس کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

اسلامی ادب کا تعارف ہو یا اس کے خدوخال توضیح ہو، ادب اسلامی کے ورثے کی بازیافت ہو یا تخلیقی ادب کی اشاعت کا بندوبست، یا پھر مغرب کے ادبی رجحانات ونظریات کا تنقیدی جائزہ ہو یا اس کے سیل رواں کے سامنے سد سکندری، سبھی مہمات کا

اصل بار مولانا رابع صاحبؒ کے کاندھوں نے ہی اٹھایا تھا، ادب اسلامی کے رجحان سے لے کر اس کے تحریک بننے تک کے سفر میں آپؒ مفکر اسلامؒ کے دست و بازو بنے رہے، اور خالص اسلامی ادبیات کو فروغ دینے کی فکر اور اس کے نصب العین کی دل وجان سے آبیاری کی جد وجہد کرتے رہے، اس مقصد کے لیے دنیائے اسلام میں مسلم ادباء کا ایک وسیع حلقہ قائم کیا اور اس کی کوششوں اور کاوشوں کو مربوط کیا۔

حضرت مولانا رابع صاحبؒ کا اصل میدان سیرت اور انسان سازی تھا، روح کی بیداری اور امت کی ترقی کے لیے اسلاف کے نمونے کا احیاء تھا، ان کے یہاں تعلیم وتزکیہ دونوں دھارے ایک ساتھ رواں نظر آتے ہیں، لیکن ان دونوں دھاروں میں ادب اسلامی کی لکیریں بھی نمایاں اور صاف دکھائی دیتی ہیں۔

حضرت مولانا کی داستان حیات کو دنیا کے پیمانہ پر ناپا جائے تو بڑی سادہ اور سپاٹ تھی، وہ نہ بینک بیلنس کے مالک تھے نہ کسی عالیشان کوٹھی اور کار کے، وہ اس دنیا میں اس طرح رہے جیسے ایک مسافر اور راہ گذر رہتا ہے، ان کا امتیاز یہی تھا کہ انھوں نے دنیا اور دنیا والوں سے کچھ نہیں لیا، لیکن اہل دنیا میں ایسی متاع بے بہا سخاوت سے لٹاتے رہے جس سے دنیا والوں کی جھولی خالی ہے اور جو صرف اہل دل کے یہاں ملتی ہے یعنی خدا شناسی و خداترسی، شائستگی و ہمدردی اور تہذیب و انسانیت کی کی خیر خواہی، وہ دنیوی اعتبار سے تہی دامن و تہی کیسہ رہے لیکن درحقیت بہت بڑا سرمایہ لے کر اُس دنیا کی طرف روانہ ہو گئے ہیں جہاں ان کا مقام صدیقین وشہداء میں ہے، انشاء اللہ!

اپنی اس تشنہ وعاجلانہ سی تحریر ختم کرنے سے پیشتر یہ عرض کردینا برمحل ہوگا کہ مولانا کے نزدیک ادبی صلاحیت بلکہ تمام انسانی صلاحیتوں کا کمال اسی میں مضمر تھا انھیں حق اور اعلی اقدار کے فروغ کا وسیلہ بنایا جائے ؎

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!

۞۞۞

اعترافِ بندگی

ڈاکٹر عطیہ خلیل عربؒ

تو ایک ہی لاریب ہے تیرے سوا کوئی نہیں
ہر شے فنا، تو ہے بقا، تیرے سوا کوئی نہیں

صبحِ ازل کی ابتدا، شامِ ابد کی انتہا
کوئی نہیں تیرے سوا، تیرے سوا کوئی نہیں

باطن بھی تو ظاہر بھی تو اول بھی تو آخر بھی تو
اور چار سو جلوہ نما تیرے سوا کوئی نہیں

امت ترے محبوب کی معتوب ہے مقہور ہے
اس کا یہاں درد آشنا تیرے سوا کوئی نہیں

ہم سب ترے محتاج ہیں، تو ہے غنی یا ذوالمنن!
مشکل کشا، حاجت روا، تیرے سوا کوئی نہیں